رجسٹرڈ ایل نمبر ۴۲۳۰

جلد ۵۸، عدد ۲ — مئی ۱۹۶۲ء

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ ترجمان القرآن

۵۔ اے ذیلدار پارک اچھرہ لاہور (پاکستان)

سالانہ چندہ ٦ روپے — قیمت فی پرچہ ٦٢ پیسے

اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی

[از سید ابوالاعلیٰ مودودی]

- تہذیب کا مفہوم کیا ہے ؟
- تہذیب کن عناصر سے مرکب ہے ؟
- اسلامی تہذیب کی بنیادیں کیا ہیں ؟
- اسلامی اور غیر اسلامی تہذیب کا فرق اور موازنہ
- غیر اسلامی تہذیبوں کا تنقیدی جائزہ
- انسانی زندگی کا اسلامی تصور
- اسلامی تصور کے انسانی زندگی پر اثرات
- اسلامی تہذیب میں ایمانیات کی اہمیت
- اسلامی تہذیب کا جامع خاکہ

اپنے موضوع پر معیاری اور تحقیقی کتاب

اسلامی تہذیب کی برتری پر مدلل تفصیلی بحث

معیاری کتابت و طباعت • ضخامت تقریباً ۳۵۰ صفحات

قیمت اعلیٰ ایڈیشن ۲۵ روپے • سستا ایڈیشن ۲۰ روپے

[★ اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ ۱۳-ای شاہ عالم مارکیٹ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۵۸ | مئی ۱۹۶۲ء | عدد ۲

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس لاہور میں چھپوا کر
دفتر "ترجمان القرآن" اچھرہ لاہور سے شائع کیا ۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

ایک موسم کے اختتام اور دوسرے کے آغاز کے درمیان کا عرصہ جسے عربی زبان میں تداخل کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے ہر فرد کے لئے بہت بڑی اہمیّت کا حامل ہوتا ہے۔ اسمیں طبیعتیں بڑی نازک اور حسّاس بن جاتی ہیں۔ اگر اس زمانہ میں معمولی سی بدپرہیزی بھی کر لی جائے تو اس سے سارے جسمانی نظام میں ایک ایسا زبردست اختلال اور بگاڑ رونما ہوتا ہے جو ایک لمبے عرصہ کے علاج معالجہ کے بعد ہی کہیں جا کر درست ہوسکتا ہے۔ دوسری طرف اگر ایک انسان تداخل کے اس دور میں حزم واحتیاط سے کام لے تو اس کی صحت پر ایسے خوشگوار اثرات مترتب ہوتے ہیں جو اس کے سارے اعضاء کو قوت اور توانائی بہم پہنچانے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے اگر تداخل کے اس دَور کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ انسانوں کی صحت اور تندرستی کے لئے ایک فیصلہ کُن مرحلہ ہے۔ جو لوگ اس کی اہمیّت کو محسوس کرتے ہوئے اس سے فائدہ اُٹھانے کے لئے کوشاں ہوتے ہیں اُن کے لئے یہ دَور ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔ اور جو اس کے تقاضوں کو نظر انداز کر کے اس میں تغافل اور لاپروائی سے کام لیتے ہیں اُن کے لئے یہ دَور بربادی کا پیغام لاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ اپنی صحت کے بارے میں بالکل بے حسّ نہیں ہوتے وہ اس دَور میں غیر معمولی احتیاط سے کام لیتے ہیں۔

جس طرح موسموں کے اُلٹ پھیر کی وجہ سے ایک ملک کے اندر سال میں کئی مرتبہ تداخل کے دَور آتے ہیں بالکل اسی طرح اجتماعی زندگی کا تغیّر و تبدّل دنیا کی مختلف قوموں کو تداخل کے دَور میں کھڑا کر کے اُنہیں اس بات کے مواقع فراہم کرتا رہتا ہے کہ وہ اس سے پورا پورا

فائدہ اُٹھائیں۔ جو قومیں اپنے حال اور مستقبل کے بارے میں بے حس نہیں ہوتیں وہ اس موقع کو غنیمت سمجھ کر اس سے بھرپور فائدہ اُٹھاتی ہیں اور اس طرح سالوں کی مسافت چند مہینوں میں طے کر لیتی ہیں۔ ان کے برعکس وہ قومیں جنہوں نے غفلت اور لاپروائی کو اپنا قومی شعار بنا رکھا ہوتا ہے وہ اس فیصلہ کُن مرحلے کی ذمہ داریوں کو بالکل نہیں سمجھتیں اور اس اہم دَور کے معاملے میں بھی اُسی مجرمانہ تغافل سے کام لیتی ہیں جس کی کہ اُن کی سہل پسند طبیعتیں عادی ہو چکی ہوتی ہیں۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ تداخل کا یہ دور انہیں تعمیر و ترقی کی راہ پر گامزن نہیں کرتا بلکہ تباہی و بربادی کے خوفناک گڑھوں میں دھکیل دیتا ہے۔ اس فیصلہ کُن مرحلہ میں اُن کی غفلت عام حالات کی بہ نسبت کہیں زیادہ تباہ کن ثابت ہوتی ہے۔ وہ بڑی سرعت کے ساتھ تنزّل کی راہ پر چل نکلتی ہیں اور بربادی کے جن مراحل کو انہیں سالوں میں طے کرنا تھا وہ اب انہیں مہینوں بلکہ گھنٹوں میں طے کرتی ہیں:

یک لحظہ غافل بودم وصد سالہ راہم دور شُد

تاریخ نے پاکستان کے مسلمانوں کو بھی اس وقت تداخل کے دَور میں لاکر کھڑا کر دیا ہے۔ مارشل لاء کی گرفت اب آہستہ آہستہ ڈھیلی ہو رہی ہے اور اس کی جگہ جمہوریت کی آزاد فضا میں قوم قدم رکھنے کے لئے پَر تول رہی ہے۔ مارشل لاء کا نفاذ کن حالات میں ہُوا یہ ایک نہایت ہی دلفگار داستان ہے جسے ہم دُہرانا نہیں چاہتے۔ پھر اس کے نفاذ کے بعد قوم نے کیا کھویا اور کیا پایا۔ یہ بھی ایک ایسا مسئلہ ہے جس کے بارے میں اس وقت کوئی حتمی رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔ اس کے لئے ہمیں اُس وقت کا انتظار کرنا پڑے گا جب تاریخ خود آگے بڑھ کر اپنا بے لاگ فیصلہ سُنا دے۔ البتہ اس ضمن میں ایک بات ہم قدرے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ کسی ملک میں مارشل لاء کا نفاذ، خواہ اُس کے وجوہ کتنے ہی صحیح ہوں، کوئی ایسی چیز نہیں جسے کوئی قوم ہنسی خوشی قبول کرے۔ اور پھر اس پر فخر کر سکے۔ اس کا قلادہ دنیا کی جس قوم نے بھی اپنی گردن میں ڈالا

ہے، بالکل مجبور ہو کر ڈالا ہے۔ کسی ملک میں مارشل لاء کے نفاذ کا مطلب یہ ہے کہ یہ قوم تباہی اور بربادی کی اُس آخری حد تک پہنچ چکی ہے جہاں اسے کسی قسم کی ترغیب و ترہیب نہیں بچا سکتی۔ بس ایک قوتِ قاہرہ ہی ہے جو اسے طاقت کے بل بوتے پر شاید سنبھالا دینے میں کامیاب ہو جائے۔

یہ وہ آخری بازی ہے جو کوئی قوم بالکل مجبوری اور مایوسی کے عالم میں زندگی کے حفظ و بقاء کے لئے کھیلتی ہے۔ یہ اگر ایک طرف کسی ڈوبتی ہوئی اور دم توڑتی ہوئی قوم کو بچانے کا آخری ذریعہ ہے تو دوسری طرف یہ اس امر کا اعلان بھی ہے کہ اس آخری کوشش کے ناکام ہو جانے کے بعد اس قوم کو تباہی سے کوئی چیز محفوظ نہیں رکھ سکتی۔ ظاہر بات ہے کہ اس آخری حربے کو کوئی معقول قوم اچھے اور خوشگوار حالات میں استعمال کرنے پر آمادہ نہیں ہوتی۔ یہ قدم وہ اُس وقت اُٹھائے گی جب اُس کی ساری قوتیں جواب دے چکی ہوں، جب اُس کے اعضاء بالکل شل ہو چکے ہوں، اور اُس کی روح نے افسردگی کے سامنے ہتھیار ڈال دئے ہوں۔ الغرض، پوری دُنیا اُس کے سامنے اندھیر ہو رہی ہو اور اُس کی حیات اجتماعی میں اُمید و رجاء کے لئے قطعاً کوئی گنجائش باقی نہ رہی ہو اور اُس بدنصیب قوم کو اس امر کا پورا پورا یقین ہو چکا ہو کہ اب نور کی کوئی بھولی بھٹکی کرن بھی اُس کی تاریک زندگی کو منوّر نہ کرے گی۔ جب ایک قوم پر فکر و احساس کے اعتبار سے یہ افسوسناک کیفیّت طاری ہو جائے تو وہ بالکل نزع کے عالم میں مارشل لاء کے کڑوے کسیلے گھونٹ پینے پر آمادہ ہوتی ہے۔ چنانچہ آپ دیکھیے کہ اس ملک میں جس وقت مارشل لاء کا نفاذ ہوا تو اس کے جواز کے حق میں جو دلائل دیے گئے ——— اور جن احساسات کا اظہار کیا گیا اُن سے ملکی بگاڑ کے بارے میں کرب و اضطراب کی ساری کیفیتیں پوری طرح جھلک رہی تھیں، اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ قدم ملک کی سالمیت کے پیشِ نظر بڑی مجبوری کے عالم میں اُٹھایا گیا ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ یہ نازک وقت کسی نہ کسی طرح گزر گیا ہے اور اب ملک میں عنقریب جمہوریت کا آغاز ہونے والا ہے۔ "تداخل" کے اس دور میں جو ہماری اجتماعی زندگی کی صحت اور تندرستی کے لئے ایک فیصلہ کن مرحلہ کی حیثیت رکھتا ہے ہم پھر ایک بار آپ کو آپ کی ذمہ داریاں یاد دلاکر آپ سے بڑے ادب و احترام کے ساتھ گذارش کرتے ہیں کہ خدارا آپ آنکھیں کھولیں اور تداخل کے اس نازک دور میں حزم و احتیاط کا ثبوت دیں اور ذاتی نفع و نقصان کو اس وقت نظر انداز کرتے ہوئے قوم کو اُس محفوظ راہ پر لے کر آگے بڑھیں جس سے اُس کی زندگی تنگ نظری، تعصب، اور ابن الوقتی کی بھول بھلیوں سے نکل سکے اور اس کے اندر اپنی خداداد صلاحیتوں کو اسلام کی سر بلندی کے لئے وقف کرنے کی تڑپ اور آرزو پیدا ہو۔ یہ استدعا ہم خالص جذبہ خیر خواہی سے کر رہے ہیں۔ ذاتی منافع اور اُن کی دلکشی اور ذاتی جاہ و جلال اور اُس کی تمکنت اپنے اندر یقیناً دلچسپی کے بہت سے سامان رکھتی ہے اور گوشت پوست کا انسان کبھی کبھی ان سے متاثر بھی ہو جاتا ہے۔ مگر زندہ قوموں کے صاحبِ احساس اور فرض شناس سربراہوں نے ان ذاتی فائدوں کو کبھی پر کاہ کے برابر بھی نہیں سمجھا اور تمہارے ہاتھ میں تو اس قوم کی قیادت اور سربراہی آنے والی ہے، جسے اس دُنیا میں خود پروردگار عالم نے شاھد علی الناس کا فرض منصبی سپرد کیا ہے۔ تم بدقسمتی سے وقتی فائدہ اور نقصان کی فکر میں اتنے کھوئے جا رہے ہو کہ تم نے اپنی حرکات کے دوررس اخلاقی نتائج سے یکسر آنکھیں بند کر لی ہیں۔ حالانکہ تمہیں اُن نفوس قدسی کی جانشینی کا فخر حاصل ہے جن کے قائدین کا تو ذکر ہی کیا معمولی سے معمولی سپاہی بھی دُنیاوی فوائد و لذائذ سے اتنے لاپرواہ اور اپنے خالق کی خوشنودی کے اتنے فکرمند تھے کہ اُن کے ہاتھ جب کروڑوں روپے کے تاج لگے تو اُنہوں نے اُن کی طرف نگاہ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ اور مال و دولت کے ان خزائن کو اپنے پھٹے پُرانے کمبل میں اوڑھ کر رات کی تاریکی کے اندر اپنے قائد کے قدموں پر لاکر ڈال دیا۔ اور یہ سارا اخفاء محض اس لئے تھا کہ اُن کے دامن صدق و اخلاص پر کہیں ریا کا دھبّہ نہ لگ جائے۔ اموِر

سلطنت کے انتظام و انصرام میں جن پاکباز لوگوں کے تم وارث ہو اُن کی قوت و طاقت کا مدار جاگیروں، سربفلک محلات، بے جان سکوں کی جھنکار اور زیب و زینت کے سامان کی فراوانی پر نہ تھا بلکہ اُن کی طاقت کا حقیقی سرچشمہ اُن کے اخلاق کی پختگی، اُن کی نیت کی درستگی اور اُن کے عمل کی مداومت پر تھا۔ اور تاریخ آخر کائنات کی اس سب سے بڑی حقیقت کو کس طرح جھٹلا سکتی ہے کہ ان فقیروں اور بوریہ نشینوں کے رُعب داب سے بڑی بڑی سلطنتیں لرز جایا کرتی تھیں۔
اور مسلمانوں کا تو ذکر ہی کیا خود غیر مسلموں نے اس حقیقت کا کھلے بندوں اعتراف کیا ہے اور اُن کے سامنے جب کسی ملک کے انتظام کا سوال پیدا ہوا تو انہوں نے مذہب کے اختلاف کے باوجود یہ بات برملا کہی کہ میری قوم کے سربراہو! اگر تمہیں ملک میں صحیح طرز کی حکومت قائم کرنا ہے تو پھر اپنے سامنے سیزر نپولین کو نہ رکھو بلکہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی پیروی اختیار کرو۔ تم نے تاریخ میں حق پرست اور عادل خلفاء کے حالات یقیناً پڑھے ہونگے۔ اور تمہاری نظروں سے اُن بدبختوں کے ظالمانہ کارنامے بھی اوجھل نہ ہونگے، جنہوں نے ظلم و استبداد کو اپنی زندگیوں کا محبوب مشغلہ بنا رکھا تھا۔ وقت خواہ کتنا ہی بُرا کیوں نہ ہو، بہرحال گذر جاتا ہے مگر وہ تاریخ میں اپنی مستقل یادگار بھی چھوڑ جاتا ہے، اور اس کے بُرے اثرات نسلوں تک چلتے رہتے ہیں۔ آپ اگر اس وقت نیکی، شرافت، عدل و انصاف کے علمبردار بنیں گے تو اس دُنیا میں خواہ آپ کو تعیش کی زندگی فراہم نہ ہو، لیکن آنے والی زندگی میں جو ابدی ہے آپ کو سکون و اطمینان حاصل ہوگا۔ آپ دُنیا و آخرت میں فائز المرام ہونگے۔ اور انسانیت نہ صرف قیامت تک آپ کو نیک نامی سے یاد رکھے گی بلکہ آپ کے احسانات کے بارِ گراں سے کبھی سبکدوش بھی نہ ہوسکے گی اور انہیں اپنی تاریخ کا ہمیشہ ایک بیش قیمت اور قابلِ فخر سرمایہ سمجھے گی۔ ہم اس وقت آپ کو یہ ناگوار بات بھی یاد دلا دیں کہ آپ کے اصل کارنامے وہ نہیں جو آپ نے اپنی ستائش میں خود تصنیف کر رکھے ہیں یا جن کا چرچا آپ کے اردگرد مداحوں اور خوشامدیوں کی زبانوں پر ہے۔ اقتدار کی پرستش ان لوگوں کا پرانا دستور ہے۔ اور یہ چیز کوئی آپکے

ساتھ مخصوص نہیں۔ ان کے سامنے جو تخت پر براجمان ہُوا وہ اس کی جائز و ناجائز تعریف میں رطب اللسان ہو گئے۔ اور جس وقت انہیں مسندِ اقتدار سے الگ کر دیا گیا تو سب سے پہلے انہیں خوشامدیوں نے اُن سے آنکھیں پھیر لیں۔ دور نہ جائیے ذرا قریب کے واقعات پر ہی ایک نگاہ ڈال لیجئے۔ کیا غلام محمد کی مدح سرائی میں ان لوگوں نے کوئی کسر اُٹھا رکھی تھی؟ کیا سکندر مرزا کی تعریف و توصیف میں کوئی کمی کی جاتی تھی؟ لیکن آج ان کا حشر کیا ہوا ہے؟ کوئی آنکھ نہیں جو ان کے فراق میں نم ہو، اور کوئی دل نہیں جس میں اُن کی کوئی خوشگوار یاد باقی ہو۔ اس بنا پر اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے کہ آپ کے اصل کارنامے وہ نہیں جنہیں سپاس ناموں کی صورت میں آپ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ بلکہ وہ ہیں جو تاریخ میں باقی رہ جائیں اور آنے والی نسلیں انہیں عزّت و احترام کی نظر سے دیکھیں۔ آپ نے تاریخ میں اُن نیک اور پاکباز لوگوں کی تصویریں دیکھی ہونگی جنہیں جب اقتدار ملا تو اُنہوں نے انسان کو انسان کی بندگی سے نکال کر خدا کی بندگی کے لئے تیار کیا، ظلم و استبداد کو دُنیا سے مٹانے کی کوشش کی، عدل و انصاف، نیکی اور شرافت کا بول بالا کیا۔ ان کے برعکس تاریخ میں تم نے اُن روسیاہ فرمانرواؤں کی تصویریں بھی دیکھی ہوں گی جن کے ہاتھ میں جب عنانِ اقتدار آئی تو اُنہوں نے خونریزی، سفاکی، زیردست آزاری کو اپنا شعار بنا لیا۔ تاریخ کی لمبی گیلری میں دونوں طرف دونوں قسم کے فرمانرواؤں کی تصویریں آویزاں ہیں اب یہ کام آپ کا ہے کہ آپ اپنی تصویر کے لئے جو جگہ چاہیں منتخب کر لیں:

ہم نیک و بد حضور کو سمجھائے دیتے ہیں

اخلاق کی قوت اس دُنیا میں انسانوں کی سب سے بڑی طاقت اور قوت رہی ہے اور کش مکشِ حیات میں آخری فتح انہیں لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو اخلاقی اعتبار سے اپنے مدِمقابل سے ارفع و اعلیٰ ثابت ہوئے ہیں۔ اخلاقی موت مر جانے کے بعد مال و متاع کی کوئی

بڑی سے بڑی مقدار اور اقتدار کی کوئی اونچی سے اونچی سند بھی کسی شخص یا گروہ کو عزت کے مقام پر فائز کرنے میں کامیاب نہیں ہوئی۔ خود قرآن مجید میں جو حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ بیان فرمایا گیا ہے تو یہ معاذ اللہ کوئی غزل خوانی نہیں بلکہ اس میں اللہ تعالیٰ نے اس حقیقت کو بے نقاب کیا ہے کہ دُنیا کی اس کش مکش میں فیصلہ کُن قوت صرف اخلاق کی قوت ہے۔ ایک طرف ایک غریب الدیار اور بے یار و مددگار انسان ہے جس کے پاس متاعِ اخلاق کے علاوہ اور کوئی پونجی نہیں۔ اور دوسری طرف اس ایک خوبی کے علاوہ ہر چیز موجود ہے۔ وہاں دنیاوی ساز و سامان ہے، مسندِ اقتدار ہے، مداحوں کی مدح و توصیف ہے، لشکر و سپاہ کی قوت و طاقت ہے۔ مگر جب اُس فقیر بے نوا سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے تو یہ دُنیاوی مال و متاع اور قوت و اقتدار کسی کام نہ آئے۔ اور آخری فتح اُسی غریب الوطن کو حاصل ہوتی ہے جو ہر قسم کی مادی نعمتوں سے محروم اپنی زندگی جیل کی تنہائیوں میں بسر کر رہا تھا۔ اخلاقی قوت نے بڑی خاموشی کے ساتھ اپنا کام شروع کیا اور عوام و خواص کے دل صرف اُسی کی محبت و احترام سے لبریز ہو گئے۔ دنیا کی کوئی قوت دلوں کی اس تبدیلی کو روکنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ چنانچہ اقتدار نے اس حقیقت کو بڑی شدت کے ساتھ محسوس کیا کہ اب اس قوت و طاقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے اُس نے مجبور ہو کر اس کے سامنے ہتھیار ڈال دئیے، اور مملکت کے وہ سارے خزانے جن کی غیر معمولی محبت نے اقتدار کے دماغی توازن کو اس حد تک خراب کر دیا کہ وہ اُسے اپنی حرکات کے دور رس اخلاقی نتائج کا بھی کوئی احساس نہ رہا تھا اُس نے خود آگے بڑھ کر ان کی کنجیاں اُس کے قدموں میں ڈال دیں۔

اقتدار صرف جوڑ توڑ کرنے، سیاسی رشوتیں دینے اور برادری کے تعصبات اُبھارنے سے ہی حاصل نہیں ہوتا۔ اس کے حصول کا ایک اور مؤثر ذریعہ بھی ہے۔ اور وہ ہے اخلاقی قوت کی تائید و نصرت۔ جو اقتدار مکر و فریب کی مختلف چالیں چل کر حاصل کیا جاتا ہے۔ وہ بر سرِ اقتدار

گروہ اور عوام دونوں کے لئے لعنت ہے۔ مسندِ اقتدار سنبھالنے والے چونکہ اخلاق کی قوّت سے محروم ہوتے ہیں اس لئے وہ اس کمی کو مختلف قسم کی چالبازیوں اور حیلہ سازیوں سے پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ چالیں کچھ دیر تک تو بظاہر کامیاب ہوتی نظر آتی ہیں لیکن درحقیقت یہ اقتدار کی بنیادوں کو اندر ہی اندر سے کھوکھلا کرتی رہتی ہیں اور ایک دن اقتدار کا وسیع الشان قصر اس طریق سے پیوندِ خاک ہوتا ہے کہ کوئی اُس کا نام لینے والا بھی باقی نہیں رہتا۔

ہمارے ہاں آخر کتنے لوگ ایسے ہوئے ہیں جنہوں نے گذشتہ پندرہ برس میں محض مکر و فریب کے ذریعے مسندِ اقتدار کو سنبھالنے کی مختلف قسم کی مذموم کوششیں کیں۔ ان میں سے چند لوگ کچھ دنوں کے لئے کامیاب بھی ہوئے، لیکن تاریخ نے ان کا جو عبرت ناک حشر کیا ہے وہ سب کے سامنے ہے۔

ان لوگوں کی ان ناپاک کوششوں اور حیلہ سازیوں سے صرف اُن کی اپنی عزّت و آبرو ہی خاک میں نہیں ملی بلکہ خود پاکستان کے وقار کو ایسا شدید نقصان پہنچا ہے جس کی تلافی بظاہر مشکل معلوم ہوتی ہے۔ الا یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت خاص سے کوئی ایسا غیر معمولی انتظام فرمادے جس سے یہ ناممکن چیز ممکن بن جائے۔ مسندِ اقتدار بذاتِ خود اپنے اندر کوئی بُرائی نہیں رکھتی یہ ایک قوت و طاقت ہے اسے اگر حق کی سربلندی کا ذریعہ بنایا جائے تو اس سے نوعِ انسانی کو غیر معمولی فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ اُس کی انسانیت نشو و نما پاتی ہے، اُس کی خفتہ قوتیں بیدار ہوتی ہیں، اُس کے مختلف طبقوں کے درمیان عدل و انصاف قائم ہوتا ہے، اُس کے اندر نیکی اور بھلائی پروان چڑھتی ہے اور معاشرے میں ظلم و استبداد، معاشی لوٹ کھسوٹ اور بے حیائی کا قلع قمع ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے میں اگر اقتدار کو ذاتی سربلندی کا ذریعہ بنا لیا جائے تو پھر معاشرے پر ایک قیامت ٹوٹ پڑتی ہے۔ سوسائٹی کے مختلف طبقات ایک دوسرے سے دست و گریباں ہوتے ہیں، بھائی بھائی سے اُلجھتا ہے اور دوست دوست

کا گلا کاٹنے پر آمادہ ہوتا ہے۔ ملک کی پوری دولت صرف چند ہاتھوں میں سمٹ کر رہ جاتی ہے اور غریبوں اور ناداروں پر عرصہ حیات اس حد تک تنگ ہو جاتا ہے کہ وہ زندگی کو ایک عذاب سمجھنے لگتے ہیں، فواحش معاشرے کے رگ و پے میں پوری طرح سرایت کر جاتے ہیں۔ اور یہ صورتِ حال جب کچھ عرصہ تک قائم رہتی ہے تو اس سے ملک کی بنیادیں متزلزل ہونے لگتی ہیں اور جلد ہی ایک ایسا وقت آجاتا ہے کہ کوئی تدبیر بھی اُس کے حفظ و بقا کے لئے کارگر ثابت نہیں ہوتی۔ دنیا کی تاریخ سیاسی سازشوں کے عبرتناک انجام سے بھری پڑی ہے۔ خود اُمت مسلمہ کو اقتدار کی اس جنگ سے جو چرکے لگے ہیں انہیں کوئی حسّاس اور فرض شناس مسلمان نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اس جنگ زرگری نے مغلیہ سلطنت جیسی عظیم الشان سلطنت کو برباد کر کے رکھ دیا۔

اندلس کے مسلمانوں پر مصائب کے جو پہاڑ ٹوٹے ہیں وہ بھی اسی کی کرشمہ سازیاں ہیں۔ اس بدنصیب ملک میں چاروں طرف سے عیسائی طاقتیں ایک گلے بندھے منصوبے کے تحت اثر و نفوذ کر رہی تھیں، لیکن یہاں کے حکمران مسندِ اقتدار کے حصول کے لئے ایک دوسرے کے خلاف صف آرا تھے۔ ہوسِ اقتدار نے انہیں اس حد تک بدمست بنا دیا تھا کہ وہ اُن خطرات سے جو عین اُن کے سروں پر منڈلا رہے تھے، یکسر غافل ہو چکے تھے۔ اُن کے سروں میں بس ایک ہی سودا سمایا ہوا تھا کہ ملک خواہ رہے یا نہ رہے لیکن اُن کا اقتدار کسی طرح قائم رہے۔ لوٹ کھسوٹ کی اس مسموم فضا سے اندلس کا پورا معاشرہ متاثر ہوا۔ اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ملک کی پانچ فی صد آبادی بھی ایسی نہ رہی جو ذاتی نفع و نقصان سے بلند ہو کر ملک کی بے لوث خدمت پر آمادہ ہوتی۔ انجام ظاہر ہے۔ اسلامی تہذیب کے اس مضبوط قلعے سے مسلمان ایک ایک کر کے نکالے گئے، اُن کی مسجدیں مسمار ہوئیں، اُن کے کتب خانے نذرِ آتش ہوئے، اُن کی عورتوں کی بے حرمتی کی گئی اور اس عظیم الشان اسلامی سلطنت پر عیسائی طاقتیں پوری طرح مسلّط ہو گئیں۔ اگر یہاں کے مسلمان فرمانروا اُس وقت ہوش سے کام لیتے جب عیسائی طاقتیں اُن کے

دروازے پر دستک دے رہی تھیں تو آج اندلس کو یہ انجام بد نہ دیکھنا پڑتا۔

ابو عبداللہ کو جب غرناطہ سے دربدر کیا گیا تو وہ اپنے عظیم الشان محلات، اپنے بیش قیمت ساز و سامان پر بار بار حسرت بھری نگاہ ڈالتا اور آہیں بھرتا۔ شہر سے کچھ فاصلے پر پہنچ کر اُسے یارائے ضبط نہ رہا، وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تو اس وقت اُس کی والدہ نے اُسے جو الفاظ کہے وہ اصحاب اقتدار کے لئے اپنے اندر عبرت کا پورا سامان رکھتے ہیں۔ اُس بڑھیا نے یہ کہا: اے بیٹے! جب عنانِ اقتدار پر تمہارا قبضہ تھا، اور تاریخ اپنے فیصلے کے لیے تمہاری تدبیر کی منتظر تھی تو اُس وقت تم نے جوانمردوں کی سی جرأت و ہمت نہ دکھائی اور اب جبکہ تاریخ نے اپنا فیصلہ تمہارے خلاف صادر کر دیا ہے اب عورتوں کی طرح آہ و بکا کرنے سے کیا حاصل؟

خدا کرے کہ اندلس کے مسلمانوں کے اس حسرتناک انجام سے پوری اُمتِ مسلمہ خصوصاً اس کے اصحابِ اقتدار سبق حاصل کریں۔ اور تاریخ کے اس فیصلہ کُن مرحلہ پر اپنے ذاتی اختلافات کو نظر انداز کرتے ہوئے کوئی ایسا مؤثر قدم اُٹھائیں جو اس کی بہتری کا ضامن ہو۔

اس مرحلہ پر ہم پھر ایک بار پاکستان کے سربراہوں سے بڑے واشگاف الفاظ میں اس حقیقت کو واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ یہ ملک جسے صرف اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا اسلامی نظام کی خیر و برکت سے ہی زندہ رہ سکتا ہے۔ جتنا رات کے بعد صبح کے طلوع ہونے کا یقین ہے اس سے کہیں زیادہ یقین ہمیں اس بات کا ہے کہ اگر اس ملک کو ایک آزاد مملکت کی حیثیت سے دنیا میں موجود رہنا ہے تو پھر اسلامی نظام کو اپنائے بغیر کوئی چارہ کار نہیں۔ یہ ایک ایسا ملک ہے جس کے مختلف طبقوں کے درمیان سوائے اسلام کے کوئی ایسی قدرِ مشترک نہیں جو اس کے مائل بہ انتشار اجزاء کو ایک دوسرے سے وابستہ رکھ سکے۔ اہلِ پاکستان کے پاس اسلام کے علاوہ کوئی ایسا نصب العین نہیں جو ان کے اندر زندگی کی حرارت اور ولولہ پیدا کرے۔ ان کے حفظ و بقا اور ان کے نشو و نما کا سارا دار و مدار اسلام اور صرف اسلام پر ہے۔ ایک ایسا ملک جس میں نہ تو جغرافیائی وحدت ہے اور نہ لسانی اور نسلی اتحاد۔

جس کے باشندے ہزاروں چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں، جہاں برادری اور ذات پات کی حدبندیاں ایک دوسرے کے درمیان حائل ہیں۔ اس ملک کی وحدت کا انحصار اسلام کی مقناطیسی قوت کے علاوہ اور کس قوت پر رکھا جا سکتا ہے؟

اسلام اس ملک کے باشندوں کے لئے کوئی سیاسی نعرہ نہیں بلکہ یہ اُن کے دل کی دھڑکن اور روح کی پکار ہے۔ وہ ایمانداری سے اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ جس طرح اس ملک کی تخلیق میں اسلام ایک فیصلہ کُن قوت ثابت ہوئی بالکل اسی طرح اُن کا مستقبل بھی صرف اسلامی نظام سے وابستہ ہے۔ اسلام سے مُنہ موڑ کر وہ اس دُنیا میں کبھی بھی عزت کے ساتھ جی نہیں سکتے۔ وہ اس حقیقت سے خوب واقف ہیں کہ اسلام کے اجتماعی تقاضوں نے ایک آزاد اسلامی مملکت کے تصوّر کو جنم دیا۔ پھر اسلامی نظام کی کشش نے ہی مطالبہ پاکستان کو ایک تحریک کی شکل میں ڈھالا اور اسلام کی محبت نے ہی انہیں اس بات پر مجبور کیا کہ وہ چار کروڑ بھائی بندوں کو ایک تنگ نظر اور متعصب اکثریت کے رحم وکرم پر چھوڑ کر، لاکھوں بچّوں کو قتل کروا کر اور لاتعداد عفت مآب بہو بیٹیوں کی عزت لُٹا کر، مردانہ وار آگے بڑھیں اور اس وقت دم نہ لیں جب تک کہ اسلام کی اس تجربہ گاہ کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو۔ اسلام اس ملک کی تاریخی قوت ہے، اسلامی نظام ہی اس ملک کی بنیاد ہے، اور اسلام ہی اس ملک کے حفظ وبقا اور ترقی کا واحد ذریعہ ہے۔ جو لوگ اس عظیم قوت کو نظرانداز کر کے آگے بڑھنا چاہتے ہیں وہ یقیناً اُن لوگوں میں سے ہیں جن کا نقشہ قرآن مجید نے ان الفاظ میں کھینچا ہے:

لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا، وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا، وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا، أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ۔ (۷ : ۱۷۹)

اُن کے پاس دل ہیں مگر سوچتے نہیں، اُن کے پاس آنکھیں ہیں مگر دیکھتے نہیں، اُن کے پاس کان ہیں مگر سُنتے نہیں، وہ مثل چارپائیوں کے ہو گئے، بلکہ ان سے بھی بدتر، اور یہی ہیں کہ غفلت میں ڈوب گئے ہیں۔

یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس ملک کا ذرّہ ذرّہ اس قسم کے ناپاک عزائم رکھنے والے لوگوں کو جھنجوڑ جھنجوڑ کر سوال کر رہا ہے، کیا تمہارے پہلو میں دل ہی نہیں کہ تم سوچ سکو کہ آخر اس ملک کے حصول کے لئے جو لاتعداد قربانیاں دی گئی تھیں وہ گورے رنگ کے حکمرانوں کی بجائے، کالے رنگ کے حکمرانوں کو مسندِ اقتدار پر متمکن کرنے کے لیے دی گئی تھیں ؟ یا ان قربانیوں کا مقصد اسلامی نظام کا احیاء تھا، کیا تم جانتے بوجھتے اس واضح حقیقت کو جھٹلانے پر مصر ہو کہ اس ملک کے لئے اگر کوئی نظام موزوں ہے تو وہ صرف اسلام ہی ہے۔ کیا تمہارے کانوں تک ہندوستان کی بدنصیب اور زندہ درگور مسلم اقلیت کی درد انگیز آہیں نہیں پہنچتیں، کیا لاکھوں شہدا جن میں لاتعداد معصوم اور منحنی کلیاں بھی شامل ہیں، کے مصائب وشدائد کی یاد تمہارے ذہنوں سے بالکل محو ہو چکی ہے، کیا اَن گنت بے بس اور بے کس عورتوں کی مظلومیت بھی تمہارے احساسِ مُردہ کو زندہ نہیں کر سکتی۔ اقتدار کی ہوس نے کیا تمہارے احساسات کو بالکل ماؤف کر دیا ہے۔ تمہاری غفلت اگر فکر و احساس کے بالکل فنا ہو جانے کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کے اندر افسردگی آجانے سے پیدا ہوئی ہے تو اسے کبھی ختم بھی ہونا چاہیئے۔ اور اس کے ختم ہونے کے لئے اس سے بہتر وقت اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

آخر تم اب کس بات کے منتظر ہو، کیا تم یہ چاہتے ہو کہ آسمان پھٹ جائے، اور آفتاب کے پُرزے پُرزے ہو کر فضائے آسمانی میں بکھر جائیں اور کرۂ ارضی دھواں بن کر ہوا میں تحلیل ہو جائے:

فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً ؕ فَقَدْ جَآءَ اَشْرَاطُهَا ۚ فَاَنّٰى لَهُمْ اِذَا جَآءَتْهُمْ ذِكْرٰىهُمْ ۔ (۴۷ — ۱۸)	پھر کیا یہ لوگ آخری فیصلہ کر دینے والی گھڑی کے منتظر ہیں کہ اچانک ان پر آنازل ہو، سو اگر اس کا انتظار ہے تو اس کی نشانیاں تو آچکیں اور جب وہ گھڑی خود آجائیگی تو اس وقت اُن کے لئے کیا ہو گا۔

آگے بڑھنے سے پہلے ہم یہاں اس امر کی صراحت کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ ہم جو اسلامی نظام کے قیام کے سلسلہ میں آپ کو بار بار توجّہ دلا رہے ہیں تو اس سے خدانخواستہ آپ کہیں اس زعم میں

مبتلا نہ ہو جائیں کہ اسلامی نظام کا قیام آپ کی معاونت کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ اگر آپ اس معاملے میں کسی غلط فہمی کا شکار رہیں تو اُسے براہِ کرم اپنے قلب و دماغ سے جلد از جلد نکال دیں۔ خداوند تعالےٰ اگرچہ اپنے بعض ارادوں کی تکمیل انسانوں کے ذریعے ہی کرتا ہے لیکن وہ بے نیاز و بلند و بالا ذات اپنے کسی کام کے لئے کسی کی دست نگر اور محتاج نہیں۔ اُس نے انسانوں کو جو بعض ذمہ داریاں سونپ رکھی ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ معاذاللہ خود ان سے پوری طرح عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ اُس نے اپنی حکمت بالغہ کے تحت یہ انتظام اس لئے فرمایا ہے تاکہ وہ انسان کو اپنے خالق اور مالک سے اپنی وفاداری ثابت کرنے کے مواقع بہم پہنچائے۔ یہ ذمہ داریاں درحقیقت آزمائش کی مختلف کڑیاں ہیں جن کے ذریعے خداوند تعالیٰ کے اطاعت گذار بندے خدا کے باغیوں اور نافرمانوں سے ممیز اور ممتاز کئے جاتے ہیں۔

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ الْأَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ۔ (۶ : ۲۰)

وہی ہے جس نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا اور تم میں سے بعض کو بعض کے مقابلے میں زیادہ بلند درجے دیئے تاکہ جو کچھ اس نے تمہیں دیا ہے اس میں تمہاری آزمائش کرے۔

اگر خداوند تعالیٰ کو اس ملک کا بقا منظور ہے تو یہاں بہر حال اسلامی نظام ہی قائم ہو گا۔ ہماری دلی آرزو اور تمنا ہے کہ یہ سعادت آپ کے حصے میں آئے اور اس معاملے میں آپ پوری دنیا کے سامنے سرخرو ہوں اور آخرت میں جب خداوند تعالیٰ کے سامنے آپ کا نامۂ اعمال پیش کیا جائے تو اُس میں آپ کی یہ خدمت نمایاں حروف میں درج ہو۔ خداوند تعالیٰ کو آپکی خدمات کی ضرورت نہیں بلکہ آپ اپنی فلاح و کامرانی کے لیے باری تعالیٰ کی تائید و نصرت کے قدم قدم پر دست نگر ہیں۔ اس سلسلہ میں ہم یہ چیز بھی آپ کے گوش گزار کر دیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو یہ موقع آپ کو بہم پہنچایا ہے اس کی بھی ایک مہلت ہے۔ اگر آپ نے اس موقع سے پورا فائدہ اُٹھا کر خداوند تعالیٰ سے اپنی وفاداری کا ثبوت پیش نہ کیا تو یقین رکھو کہ وہ تمہارا احسان مند

نہیں کہ تمہیں قیامت تک مسلسل مواقع فراہم کرتا رہے، اُس کی کائنات انسانوں سے بھری پڑی ہے وہ تمہیں اقتدار کی اس مسند سے ہٹا کر دوسرے لوگوں کو اس پر متمکن کر دے گا جیسا کہ اس نے ہمیشہ کیا ہے:

وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُوالرَّحْمَةِ ۚ إِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ مِنْۢ بَعْدِكُمْ مَّا يَشَآءُ كَمَآ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ اٰخَرِيْنَ - (۶ : ۱۳۴)

تمہارا رب بے نیاز ہے اور مہربانی اس کا شیوہ ہے اگر وہ چاہے تو تم لوگوں کو لے جائے اور تمہاری جگہ دوسرے لوگوں کو متمکن کر دے جس طرح کہ خود تم کو دوسروں میں سے اُس نے منتخب کیا تھا

ایک دوسرے مقام پر اسی حقیقت کو اس طرح بیان فرمایا گیا:

اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ مَا لَمْ نُمَكِّنْ لَّكُمْ وَاَرْسَلْنَا السَّمَآءَ عَلَيْهِمْ مِّدْرَارًا وَّجَعَلْنَا الْاَنْهٰرَ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَاَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ - (۶ : ۶)

کیا اُنہوں نے دیکھا نہیں کہ ان سے پہلے کتنی ایسی قوموں کو ہم ہلاک کر چکے ہیں جن کا اپنے اپنے زمانہ میں دور دورہ رہا ہے۔ اُن کو ہم نے زمین میں وہ اقتدار بخشا جو تمہیں نہیں بخشا ہے ان پر ہم نے آسمان سے خوب بارشیں برسائیں اور ان کے نیچے نہریں بہا دیں (مگر جب اُنہوں نے کفرانِ نعمت کیا تو) آخر کار ہم نے ان کے گناہوں کی پاداش میں انہیں تباہ کر دیا اور ان کی جگہ دوسرے دَور کی قوموں کو سربلند کر دیا۔

نامناسب نہ ہوگا اگر ہم چند باتیں پاکستان کے تعلیم یافتہ طبقے کی خدمت میں بھی عرض کر دیں۔ اس وقت حصول اقتدار کے لئے جو کشمکش جاری ہے اُس میں اگرچہ آپ براہِ راست شریک نہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ آپ کش مکش کے اس فیصلہ کُن مرحلے کو ایک غیر متعلق تماشائی بن کر گذار دیں۔ ملک میں اس وقت اقتدار کے حصول کے لئے مختلف طبقوں کے درمیان جو مسابقت جاری ہے اُس میں اور رسّہ کشی کے کھیل میں بہرحال ایک بنیادی فرق ہے۔ خدارا اس الیکشن کو

محض ایک کھیل تماشہ نہ سمجھیں۔ اس کے نتائج آپ کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی زندگی پر اثر انداز ہونگے اور مستقبل میں ملک کی تعمیر و ترقی کی سمت انہیں کے مطابق متعین کی جائے گی۔ اگر آپ نے اس مرحلہ کو اپنی روایتی لاپروائی سے گزار دیا تو آپ کا رویہ مجرمانہ تغافل سے کم نہ ہوگا۔ آپ اس ملک کی ایک بڑی قوت ہیں۔ براہِ کرم اپنی اس قوت کو پہچانیے اور اس سے صحیح طریق سے کام لینا سیکھیے۔ اللہ نے آپ کو علم کا نور عطا کر رکھا ہے۔ پہلے اپنے دل و دماغ کو منور کیجیے اور پھر اس کی مدد سے جہالت کی تاریکیوں کے خلاف مسلسل جہاد کرتے چلے جائیے۔ اور دنیا پر اس حقیقت کو ثابت کر دیجئے کہ علم کوئی گورکھ دھندا نہیں کہ جس سے لوگوں کو دھوکے دئیے جائیں بلکہ وہ ایک روشنی ہے جس سے آدمی دوسروں کو روشنی دکھا سکتا ہے۔ ہمیں اس امر کا پورا احساس ہے کہ اس وقت اس ملک میں کئی قسم کی تاریکیاں پھیلی ہوئی ہیں، کہیں ذات پات اور برادری کے تعصبات نے عوام کو اندھا کر رکھا ہے، کہیں ذاتی لالچ نے لوگوں کو ضمیر و ایمان کی روشنی سے محروم کر دیا ہے، لیکن اس تاریک فضا کے کناروں پر ہمیں روشنی کی کرنیں صاف دکھائی دے رہی ہیں اور وہ آنکھوں آنکھوں میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہیں کہ اسلامی نظام کی صبح نمودار ہونے والی ہے سنت اللہ بس اسی بات کی منتظر ہے کہ تم اس راہ میں تھوڑی سی تگ و دو کرو تاکہ فلاح و کامرانی کی خلعت تمہیں پہنا دی جائے۔

یہ بات اس ملک کے مستقبل کے لئے ایک فال نیک ہے کہ اس ملک کا پریس بحیثیت مجموعی اسلامی نظام کا ہمیشہ حامی اور مؤید رہا ہے اور اس نے نازک سے نازک مرحلہ پر بھی ملک کے اس بنیادی تقاضے سے تغافل نہیں برتا۔ ہم اس وقت پھر اُسے اُس کا فرض یاد دلاتے ہیں اور اس بات کی قوی اُمید رکھتے ہیں کہ وہ تداخل کے اس فیصلہ کُن مرحلے میں پہلے سے کہیں زیادہ مستعدی، جرأت اور امانت و دیانت کا ثبوت دیگا۔ جب حالات حق کے لئے بالکل سازگار ہوں اس وقت بھی حق کی حمایت یقیناً ایک بہت بڑی نیکی اور سعادت ہے۔ اور اللہ کے ہاں اجر کی مستحق، لیکن اس اجر

میں اُس وقت کئی گُنا اضافہ ہوجاتا ہے جب حالات نامساعد ہوں، جب اخلاص و دیانت کی ٹمٹماتی ہوئی شمع مکر و فریب کے طوفانوں میں بجھنے لگے، جب انسانیت کے بہی خواہ حالات کے ہاتھوں مجبور ہوں کہ اصول و صداقت کے کٹھن راستے کو ترک کرکے عام لوگوں کے رنگ میں رنگ جائیں اور حق پرستی کا مسلک اختیار کرنے کی بجائے آسان پسندی کا شیوہ اختیار کریں۔

اس حوصلہ شکن ماحول میں جو لوگ حق پرستی کی شمع روشن کرنے کی کوشش کرتے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں اپنی خاص نعمتوں سے سرفراز فرماتا ہے، آسمان سے فرشتے اُن کی تسلّی اور ہمت افزائی کے لئے نازل ہوتے ہیں اور وہ اُن حق پرستوں میں سے ایک ایک کو پکار کر بآواز بلند کہتے ہیں:

لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا

آخر میں ہم عوام سے بھی بڑی دلسوزی کے ساتھ یہ گذارش کرتے ہیں، وہ بھی دین کے معاملے میں اپنے فرائض کو پوری طرح پہچاننے کی کوشش کریں۔ اس ملک میں اگر کچھ لوگوں کو جاہلیت پھیلانے کی جرأت ہوئی ہے تو اُس کی وجہ تمہاری جہالت ہے۔ اگر تمہارے اندر دین کا پورا شعور اور احساس ہو تو یہ گروہ تمہارے خوف سے اپنی کمین گاہوں میں دبک کر بیٹھ جائے، اور کبھی باہر نکلنے کا نام تک نہ لے۔ اسلام سے تمہاری نیم دلانہ وابستگی ہی اُسے حوصلہ مند بناتی ہے۔ یہ گروہ جب یہ دیکھتا ہے کہ تمہیں اپنا مال و متاع خدا سے زیادہ محبوب ہے، وہ جب یہ محسوس کرتا ہے کہ تمہیں خدا سے زیادہ اپنی جانوں سے پیار ہے، تو پھر وہ تمہارے ضمیر کا سودا کرنے کے لیے مختلف منصوبے بناتا ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ تمہارا ایمان ایک قابلِ فروخت مال ہے، جسے دنیاوی مال و متاع اور برادری کے تعلقات سے خریدا جاسکتا ہے۔ خدارا اُس دن سے ڈرو جب دُنیا کا یہ ساز و سامان اور برادری کے یہ تعلقات تمہارے کسی کام نہ آسکیں گے۔ اور اللہ تعالیٰ ہر شخص کے اعمال کو انصاف کی معتدل میزان پر تول کر فیصلہ صادر کرے گا۔ اگر تم برادری کے بااثر لوگوں کی ناراضگی کے خوف سے حق کو پس پشت ڈالنے کے لئے تیار ہو جاتے ہو تو ذرا اُس جبار و قہار خالق

کی ناراضگی کا بھی اندازہ کرلو جس کی گرفت سے تمہیں کوئی قوت بچا نہیں سکتی۔ آخر خدا کے تعلق سے بڑھ کر کونسا تعلق ایسا ہے جس پر مستقل طور پر بھروسہ کیا جاسکے۔ اور رب العالمین کے خزانوں کے علاوہ کون سے وہ ایسے خزانے ہیں جن سے تم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے فائدہ اُٹھا سکو۔

ضروری اعلان

ہم نے اس امر کا اہتمام کیا ہے کہ اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ مکتبہ "چراغِ راہ"۔ مکتبہ تعمیر انسانیت اور دوسرے اسلامی لٹریچر شائع کرنے والے اداروں کی کتب دفتر ترجمان القرآن سے بھی ضرورت مند حضرات کو مل سکیں۔ قارئین کرام اپنی ضرورت کے مطابق آرڈر بھیج سکتے ہیں۔

نیجر شعبۂ کتب ادارۂ "ترجمان القرآن"۔ اچھرہ۔ لاہور (پاکستان)

خریداران "ترجمان القرآن" سے التماس

۱۔ چندہ کے منی آرڈر کوپن پر اپنا پورا پتہ صاف اور خوش خط لکھیے۔ خصوصاً ڈاک خانہ اور ضلع کا نام انگریزی کے بڑے حروف میں لکھیے!

۲۔ تبدیلی پتہ کی فرمائش ہر مہینہ کی ۱۵ تاریخ تک دفتر میں پہنچ جانی چاہیے جس میں پُرانا اور نیا تبدیل شدہ پتہ دونوں نمبر خریداری کے حوالہ سے درج ہوں۔

۳۔ اجرائے رسالہ کے لیے پیشگی چندہ بھیجئے۔ قرض یا وعدہ پر رسالہ نہیں جاری کیا جاتا۔ یا وی۔پی کی اجازت دیجئے۔

(مینجر)

تفہیم القرآن

الاحزاب

(۸)

اگر منافقین، اور وہ لوگ جن کے دلوں میں خرابی ہے[۱۱۲]، اور وہ جو مدینہ میں ہیجان انگیز افواہیں پھیلانے والے ہیں[۱۱۳]، اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے تو ہم ان کے خلاف کارروائی کرنے کے لیے تمہیں اُٹھا کھڑا کرینگے، پھر وہ اس شہر میں مشکل ہی سے تمہارے ساتھ رہ سکیں گے۔ ان پر ہر طرف سے لعنت کی بوچھاڑ ہوگی، جہاں کہیں پائے جائیں گے پکڑے جائیں گے اور بُری طرح مارے جائیں گے۔ یہ اللہ کی سنت ہے جو ایسے لوگوں کے معاملے میں پہلے سے چلی آرہی ہے، اور تم اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے[۱۱۴]۔

---

[۱۱۲] "دل کی خرابی" سے مُراد یہاں دو قسم کی خرابیاں ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی اپنے آپ کو مسلمانوں میں شمار کرانے کے باوجود اسلام اور مسلمانوں کا بدخواہ ہو۔ دوسرے یہ کہ آدمی بدنیتی اور مجرمانہ ذہنیت میں مبتلا ہو اور اس کے ناپاک رُجحانات اس کی حرکات و سکنات سے پھوٹے پڑتے ہوں۔

[۱۱۳] اس سے مراد وہ لوگ ہیں، جو مسلمانوں میں گھبراہٹ پھیلانے اور ان کے حوصلے پست کرنے کے لیے آئے دن مدینے میں اس طرح کی خبریں اُڑایا کرتے تھے کہ فلاں جگہ مسلمانوں کو بڑی زک پہنچی ہے اور فلاں جگہ مسلمانوں کے خلاف بڑی طاقت جمع ہو رہی ہے اور عنقریب مدینہ پر اچانک حملہ ہونے والا ہے۔ اس کے ساتھ اُن کا ایک مشغلہ یہ بھی تھا کہ وہ خاندانِ نبوّت اور شرفائے مسلمین کی خانگی زندگی کے متعلق طرح طرح کے افسانے گھڑتے اور پھیلاتے تھے تاکہ اس سے عوام میں بدگمانیاں پیدا ہوں اور مسلمانوں کے اخلاقی اثر کو نقصان پہنچے۔

[۱۱۴] یعنی یہ اللہ کی شریعت کا ایک مستقل ضابطہ ہے کہ ایک اسلامی معاشرے اور ریاست میں اس طرح

لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ قیامت کی گھڑی کب آئے گی۔[۱۱۵] کہو، اس کا علم تو اللہ ہی کو ہے تمہیں کیا خبر شاید کہ وہ قریب ہی آ لگی ہو۔ بہرحال یہ یقینی امر ہے کہ اللہ نے کافروں پر لعنت کی ہے اور ان کے لیے بھڑکتی ہوئی آگ مہیا کر دی ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے، کوئی حامی و مددگار نہ پاسکیں گے۔ جس روز ان کے چہرے آگ پر الٹ پلٹ کیے جائیں گے اس وقت وہ کہیں گے کہ "کاش ہم نے اللہ اور رسول کی اطاعت کی ہوتی" اور کہیں گے "اے رب ہمارے، ہم نے اپنے سرداروں اور اپنے بڑوں کی اطاعت کی اور انہوں نے ہمیں راہ راست سے بے راہ کر دیا۔ اے رب، ان کو دُہرا عذاب دے اور ان پر سخت لعنت کر۔"[۱۱۶] ع ۸

اے لوگو جو ایمان لائے ہو،[۱۱۷] ان لوگوں کی طرح نہ بن جاؤ جنہوں نے موسیٰ کو اذیتیں دی تھیں، پھر اللہ

کے مفسدین کو کبھی پھلنے پھولنے کا موقع نہیں دیا جاتا۔ جب بھی کسی معاشرے اور ریاست کا نظام خدائی شریعت پر قائم ہوگا اس میں ایسے لوگوں کو پہلے متنبہ کر دیا جائے گا۔ تاکہ وہ اپنی روش بدل دیں، اور پھر جب وہ باز نہ آئیں گے تو سختی کے ساتھ ان کا استیصال کر ڈالا جائے گا۔

۱۱۵ اس سوال سے مقصود محض علم حاصل کرنا نہ تھا۔ دراصل منافقین اور کفار یہ سوال دل لگی اور استہزاء کے طور پر کرتے تھے۔ ان کو آخرت کے آنے کا یقین نہ تھا۔ قیامت کے تصوّر کو وہ محض ایک خالی خولی دھمکی سمجھتے تھے۔ وہ قیامت کے آنے کی تاریخ اس لیے دریافت نہیں کرتے تھے کہ اس کے آنے سے پہلے وہ اپنے معاملات درست کر لینے کا ارادہ رکھتے ہوں، بلکہ ان کا یہ سوال درحقیقت اس معنی میں تھا کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے تمہیں نیچا دکھانے کے لیے یہ کچھ کیا ہے۔ اور آج تک تم ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکے ہو، اب ذرا ہمیں بتاؤ تو سہی کہ آخر وہ قیامت کب برپا ہوگی جب ہماری خبر لی جائے گی۔

۱۱۶ یہ مضمون قرآن مجید میں متعدد مقامات پر بیان ہوا ہے۔ مثال کے طور پر حسب ذیل مقامات ملاحظہ ہوں: اعراف، ۷-۱۸۔ النازعات، ۴۲-۴۶۔ سبا، ۳-۵۔ الملک، ۲۵-۲۷۔ المطففین، ۱۰-۱۷۔ الحجر، ۲-۳۔ الفرقان، ۲۷-۲۹۔ حٰم السجدہ، ۲۶-۲۹۔

۱۱۷ یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ قرآن مجید میں "اے لوگو جو ایمان لائے ہو" کے الفاظ سے کہیں تو سچے اہلِ ایمان کو خطاب کیا گیا ہے، اور کہیں مسلمانوں کی جماعت بحیثیت مجموعی مخاطب ہے جس میں مومن اور منافق اور

لئے ان کی بنائی ہوئی باتوں سے اُس کی براءت فرمائی اور وہ اللہ کے نزدیک باعزّت تھا[۱۱۸]۔ اے ایمان لانے والو، اللہ سے ڈرو اور ٹھیک بات کیا کرو۔ اللہ تمہارے اعمال درست کر دے گا اور تمہارے قصوروں سے درگزر فرمائے گا۔ جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے اُس نے بڑی کامیابی حاصل کی۔

ضعیف الایمان سب شامل ہیں، اور کہیں رُوئے سخن خالص منافقین ہی کی طرف ہے۔ منافقین اور ضعیف الایمان لوگوں کو الذین آمنوا کہہ کر جب مخاطب کیا جاتا ہے تو اس سے مقصود اُن کو شرم دلانا ہوتا ہے کہ تم لوگ دعویٰ تو ایمان لانے کا کرتے ہو اور حرکتیں تمہاری یہ کچھ ہیں۔ سیاق و سباق پر غور کرنے سے ہر جگہ بآسانی معلوم ہو جاتا ہے کہ کس جگہ الذین آمنوا سے مراد کون لوگ ہیں۔ یہاں سلسلۂ کلام صاف بتا رہا ہے کہ مخاطب عام مسلمان ہیں۔

۱۱۸؎ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ اے مسلمانو تم یہودیوں کی سی حرکتیں نہ کرو۔ تمہاری روش اپنے نبی کے ساتھ وہ نہ ہونی چاہیے جو بنی اسرائیل کی روش موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تھی۔ بنی اسرائیل خود مانتے ہیں کہ حضرت موسیٰ ان کے سب سے بڑے محسن تھے۔ جو کچھ بھی یہ قوم بنی، انہی کی بدولت بنی۔ ورنہ مصر میں اس کا انجام ہندوستان کے شودروں سے بھی بدتر ہوتا۔ لیکن اپنے اس محسنِ اعظم کے ساتھ اس قوم کا جو سلوک تھا اس کا اندازہ کرنے کے لیے بائیبل کے حسب ذیل مقامات پر صرف ایک نظر ڈال لینا ہی کافی ہے:

کتاب خروج۔ ۵: ۲۰-۲۱-۱۴: ۱۱-۱۲-۱۶: ۲-۳-۱۷: ۳-۴

کتاب گنتی۔ ۱۱: ۱-۱۵-۱۴: ۱-۱۰-۱۶ مکمل۔ ۲۰: ۱-۵

قرآن مجید بنی اسرائیل کی اسی محسن کشی کی طرف اشارہ کر کے مسلمانوں کو متنبہ کر رہا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہ طرزِ عمل اختیار کرنے سے بچو، ورنہ پھر اسی انجام کے لیے تیار رہو جو یہودی دیکھ چکے ہیں اور دیکھ رہے ہیں۔

یہی بات متعدد مواقع پر خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ارشاد فرمائی ہے۔ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں میں کچھ مال تقسیم کر رہے تھے۔ اس مجلس سے جب لوگ باہر نکلے تو ایک شخص نے کہا "محمدؐ نے اس تقسیم میں خدا اور آخرت کا کچھ بھی لحاظ نہ رکھا"۔ یہ بات حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے سُن لی اور جا کر حضور سے عرض کیا کہ آج آپ پر یہ باتیں بنائی گئی ہیں۔ آپ نے جواب میں فرمایا رحمۃ اللہ علیٰ موسیٰ فانہ اوذی باکثر من ھٰذا فصبر۔ اللہ کی رحمت ہو موسیٰ پر۔ انہیں اس سے زیادہ اذیتیں دی

ہم نے اِس امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو وہ اُسے اُٹھانے کے لیے تیار نہ ہوئے اور اس سے ڈر گئے، مگر انسان نے اسے اُٹھالیا، بے شک وہ بڑا ظالم اور جاہل ہے۔ ۱۱۹ اس بارِ امانت کو اُٹھانے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اللہ منافق مردوں اور عورتوں کو اور مشرک مردوں اور عورتوں کو سزا دے اور مومن مردوں اور عورتوں کی توبہ قبول کرے، اللہ درگزر فرمانے والا اور رحیم ہے۔

گئیں اور اُنہوں نے صبر کیا۔ (مسند احمد۔ ترمذی۔ ابوداؤد)

۱۱۹ کلام کو ختم کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ انسان کو یہ احساس دلانا چاہتا ہے کہ دُنیا میں اس کی حقیقی حیثیت کیا ہے اور اس حیثیت میں ہوتے ہوئے اگر وہ دُنیا کی زندگی کو محض ایک کھیل سمجھ کر بے فکری کے ساتھ غلط رویّہ اختیار کرتا ہے تو کس طرح اپنے ہاتھوں خود اپنا مستقبل خراب کرتا ہے۔

اس جگہ "امانت" سے مراد وہی "خلافت" ہے جو انسان کو زمین میں عطا کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو طاعت و معصیت کی جو آزادی بخشی ہے، اور اس آزادی کو استعمال کرنے کے لیے اُسے اپنی بے شمار مخلوقات پر تصرف کے جو اختیارات عطا کیے ہیں اُن کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انسان خود اپنے اختیاری اعمال کا ذمہ دار قرار پائے اور اپنے صحیح طرزِ عمل پر اجر کا اور غلط طرزِ عمل پر سزا کا مستحق بنے۔ یہ اختیارات چونکہ انسان نے خود حاصل نہیں کیے ہیں بلکہ اللہ نے اسے دیے ہیں، اور ان کے صحیح و غلط استعمال پر وہ اللہ کے سامنے جواب دہ ہے، اس لیے قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر ان کو "خلافت" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، اور یہاں انہی کے لیے "امانت" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

یہ امانت کتنی اہم اور گراں بار ہے، اس کا تصوّر دلانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ آسمان و زمین اپنی ساری عظمت کے باوجود اور پہاڑ اپنی زبردست جسامت و متانت کے باوجود اس کے اُٹھانے کی طاقت اور ہمت نہ رکھتے تھے، مگر انسان ضعیف البُنیان نے اپنی ذرا سی جان پر یہ بھاری بوجھ اُٹھا لیا ہے۔ زمین و آسمان کے سامنے اس بارِ امانت کا پیش کیا جانا، اور ان کا اسے اُٹھانے سے انکار کرنا اور ڈر جانا، ہوسکتا ہے کہ لغوی معنی میں ہو، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ بات استعارے کی زبان میں ارشاد ہوئی ہو۔ اللہ تعالیٰ کا اپنی مخلوقات کے ساتھ جو تعلق ہے اسے ہم نہ جان سکتے ہیں نہ سمجھ سکتے ہیں۔ زمین اور سورج اور چاند اور پہاڑ

جس طرح ہمارے لیے گونگے، بہرے اور بے جان ہیں، ضروری نہیں ہے کہ اللہ کے لیے بھی وہ ایسے ہی ہوں۔ اللہ اپنی ہر مخلوق سے بات کرسکتا ہے اور وہ اس کو جواب دے سکتی ہے۔ اس کی کیفیت کا سمجھنا ہمارے فہم و ادراک سے بالاتر ہے۔ اس لیے یہ بالکل ممکن ہے کہ فی الواقع اللہ نے ان کے سامنے یہ بارِ گراں پیش کیا ہو اور وہ اسے دیکھ کر کانپ اُٹھے ہوں اور اُنہوں نے اپنے مالک و خالق سے واقعی یہ عرض کیا ہو کہ ہم تو سرکار کے بے اختیار خادم ہی بن کر رہنے میں اپنی خیر پاتے ہیں، ہماری یہ ہمّت نہیں ہے کہ نافرمانی کی آزادی لے کر اُس کا حق ادا کرسکیں اور حق ادا نہ کرنے کی صورت میں حضور کی سزا برداشت کرسکیں۔ اسی طرح یہ بھی بالکل ممکن ہے کہ ہماری موجودہ زندگی سے پہلے پوری نوعِ انسانی کو اللہ تعالیٰ نے کسی اور نوعیت کا وجود بخش کر اپنے سامنے حاضر کیا ہو اور اس نے یہ اختیارات سنبھالنے پر خود آمادگی ظاہر کی ہو۔ اس بات کو ناممکن قرار دینے کے لیے ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ اس کو دائرۂ امکان سے خارج قرار دینے کا فیصلہ تو وہی شخص کرسکتا ہے جو اپنے ذہن و فکر کی استعداد کا غلط اندازہ لگا بیٹھا ہو۔ البتہ یہ امر بھی اتنا ہی ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بات محض تمثیلی انداز میں فرمائی ہو اور صورتِ معاملہ کی غیر معمولی اہمیّت کا تصوّر دلانے کے لیے اس طرح کا نقشہ پیش کیا گیا ہو کہ گویا ایک طرف زمین و آسمان اور ہمالہ جیسے پہاڑ کھڑے ہیں اور دوسری طرف ۵-۶ فیٹ کا آدمی کھڑا ہُوا ہے۔ اللہ تعالیٰ پوچھتا ہے کہ "میں اپنی ساری مخلوقات میں سے کسی ایک کو یہ طاقت بخشنا چاہتا ہوں کہ وہ میری خدائی میں رہتے ہوئے خود اپنی رضا و رغبت سے میری بالاتری کا اقرار اور میرے احکام کی اطاعت کرنا چاہے تو کرے، ورنہ وہ میرا انکار بھی کرسکے گا اور میرے خلاف بغاوت کا جھنڈا بھی لے کر اُٹھ سکے گا۔ یہ آزادی دے کر میں اُس سے اس طرح چھپ جاؤں گا کہ گویا میں کہیں موجود نہیں ہوں۔ اور اس آزادی کو عمل میں لانے کے لیے میں اس کو وسیع اختیارات دوں گا، بڑی قابلیتیں عطا کروں گا، اور اپنی بے شمار مخلوقات پر اس کو بالادستی بخش دوں گا، تاکہ وہ کائنات میں جو ہنگامہ بھی برپا کرنا چاہے کرسکے۔ اس کے بعد میں ایک وقتِ خاص پر اس کا حساب لوں گا۔ جس نے میری بخشی ہوئی آزادی کو غلط استعمال کیا ہوگا اسے وہ سزا دوں گا جو میں نے کبھی اپنی کسی مخلوق کو نہیں دی ہے، اور جس نے نافرمانی کے سارے مواقع پاکر بھی میری فرمانبرداری ہی اختیار کی ہوگی اسے وہ بلند مرتبے عطا کروں گا جو میری کسی مخلوق کو نصیب نہیں ہوئے ہیں۔ اب بتاؤ، تم میں سے کون اس امتحان گاہ میں

اُترنے کو تیار ہے ؟" یہ تقریر سُن کر پہلے تو ساری کائنات میں سناٹا چھا جاتا ہے۔ پھر ایک سے ایک بڑھ کر گراں ڈیل مخلوق گھٹنے ٹیک کر التجا کرتی چلی جاتی ہے کہ اسے اس کڑے امتحان سے معاف رکھا جائے۔ آخر کار ایک مُشتِ استخواں اُٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ اے میرے رب، میں یہ امتحان دینے کے لیے تیار ہوں۔ اس امتحان کو پاس کر کے تیری سلطنت کا سب سے اونچا عہدہ مل جانے کی اُمید ہے، اس لیے فیل ہو جانے کی صورت میں جو خطرات ہیں ان سب کو میں انگیز کر جاؤں گا ـــــ یہ نقشہ اپنی چشمِ تصوّر کے سامنے لا کر ہی آدمی اچھی طرح اندازہ کر سکتا ہے کہ وہ کائنات میں کس نازک مقام پر کھڑا ہوا ہے۔

اب جو شخص اس امتحان گاہ میں بے فکرا بن کر رہتا ہے اور کوئی احساس نہیں رکھتا کہ وہ کتنی بڑی ذمہ داری کا بوجھ اُٹھائے ہوئے ہے اور دُنیا کی زندگی میں اپنے لیے کوئی رویّہ انتخاب کرتے وقت جو فیصلے وہ کرتا ہے ان کے صحیح یا غلط ہونے سے کیا نتائج نکلنے والے ہیں، اسی کو اللہ تعالیٰ اس آیت میں ظلوم و جہول قرار دے رہا ہے۔ وہ جہول ہے، کیونکہ اس احمق نے اپنے آپ کو غیر ذمّہ دار سمجھ لیا ہے۔ اور وہ ظلوم ہے، کیونکہ وہ خود اپنی تباہی کا سامان کر رہا ہے اور اپنے ساتھ نہ معلوم کتنے اور لوگوں کو لے ڈوبنا چاہتا ہے۔

تفہیم القرآن

سبا

نام آیت ۱۵ کے فقرے لَقَدْ كَانَ لِسَبَإٍ فِي مَسْكَنِهِمْ آيَةٌ سے ماخوذ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ سورۃ جس میں سبا کا ذکر آیا ہے۔

زمانۂ نزول اس کے نزول کا ٹھیک زمانہ کسی معتبر روایت سے معلوم نہیں ہوتا۔ البتہ اندازِ بیان سے محسوس ہوتا ہے کہ یا تو وہ مکّہ کا دورِ متوسط ہے یا دورِ اوّل۔ اور اگر دورِ متوسط ہے تو غالباً اس کا ابتدائی زمانہ ہے جبکہ ظلم وستم کی شدّت شروع نہ ہوئی تھی اور ابھی صرف تضحیک واستہزاء، افواہی جنگ، جھوٹے الزامات اور وسوسہ اندازیوں سے اسلام کی تحریک کو دبانے کی کوشش کی جارہی تھی۔

موضوع اور مضمون اس سورہ میں کفار کے اُن اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے جو وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ توحید وآخرت پر اور خود آپ کی نبوّت پر زیادہ تر طنز وتمسخر اور بیہودہ الزامات کی شکل میں پیش کرتے تھے۔ ان کے اعتراضات کہیں نقل کرکے ان کا جواب دیا گیا ہے، اور کہیں تقریر سے خود یہ ظاہر ہوجاتا ہے کہ یہ کس اعتراض کا جواب ہے۔ جوابات اکثر وبیشتر تفہیم وتذکیر اور استدلال کے انداز میں ہیں، لیکن کہیں کہیں کفار کو ان کی ہٹ دھرمی کے بُرے انجام سے ڈرایا بھی گیا ہے۔ اسی سلسلے میں حضرت داؤدؑ وسلیمانؑ اور قوم سبا کے قصّے اس غرض کے لیے بیان کیے گئے ہیں کہ تمہارے سامنے تاریخ کی یہ دونوں مثالیں موجود ہیں۔ ایک طرف حضرت داؤدؑ اور سلیمانؑ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے بڑی طاقتیں بخشیں اور وہ شوکت وحشمت عطا کی جو پہلے کم ہی کسی کو ملی ہے، مگر یہ سب کچھ پاکر وہ کبر وغرور میں مبتلا نہ ہوئے بلکہ اپنے رب کے خلاف بغاوت کرنے کے بجائے اس کے شکر گزار بندے ہی بنے رہے۔ اور دوسری طرف سبا کی قوم ہے جسے اللہ نے جب اپنی نعمتوں سے نوازا تو وہ پھول گئی اور آخر کار اس طرح پارہ پارہ ہوئی

کر اس کے بس افسانے ہی اب دُنیا میں باقی رہ گئے ہیں۔ ان دونوں مثالوں کو سامنے رکھ کر خود رائے قائم کرو کہ توحید و آخرت کے یقین اور شکرِ نعمت کے جذبے سے جو زندگی بنتی ہے وہ زیادہ بہتر ہے یا وہ زندگی جو کفر و شرک اور انکارِ آخرت اور دنیا پرستی کی بنیاد پر بنتی ہے۔

اللہ کے نام سے جو رحمان اور رحیم ہے

حمد اُس خدا کے لیے ہے جو آسمانوں اور زمین کی ہر چیز کا مالک ہے[1] اور آخرت میں بھی اسی کے لیے حمد ہے[2]۔ وہ دانا اور باخبر ہے[3]۔ جو کچھ زمین میں جاتا ہے اور جو کچھ اُس سے نکلتا ہے،

---

[1] حمد کا لفظ عربی زبان میں تعریف اور شکر دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے اور یہاں دونوں معنی مراد ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ ساری کائنات اور اس کی ہر چیز کا مالک ہے تو لامحالہ اس کائنات میں جمال و کمال اور حکمت و قُدرت اور صناعی و کاریگری کی جو شان بھی نظر آتی ہے اس کی تعریف کا مستحق وہی ہے۔ اور اس کائنات میں رہنے والا جس چیز سے بھی کوئی فائدہ یا لطف و لذّت حاصل کر رہا ہے اس پر خدا ہی کا شکر اسے ادا کرنا چاہیے۔ کوئی دوسرا جب ان اشیاء کی ملکیت میں شریک نہیں ہے تو نہ اسے حمد کا استحقاق پہنچتا ہے نہ شکر کا۔

[2] یعنی جس طرح اس دنیا کی ساری نعمتیں اُسی کی بخشش ہیں اسی طرح آخرت میں بھی جو کچھ کسی کو ملے گا اسی کے خزانوں سے اور اسی کی عطا سے ملے گا، اس لیے وہاں بھی وہی تعریف کا مستحق بھی ہے اور شکر کا مستحق بھی۔

[3] یعنی اس کے سارے کام کمال درجہ حکمت و دانائی پر مبنی ہیں، جو کچھ کرتا ہے بالکل ٹھیک کرتا ہے۔ اور اسے اپنی ہر مخلوق کے متعلق پورا علم ہے کہ وہ کہاں ہے، کس حال میں ہے، کیا اس کی ضروریات ہیں، کیا کچھ اس کی مصلحت کے لیے مناسب ہے، کیا اس نے اب تک کیا ہے اور آگے کیا اس سے صادر ہونے والا ہے۔ وہ اپنی بنائی ہوئی دُنیا سے بے خبر نہیں ہے بلکہ اسے ذرّے ذرّے کی حالت پوری طرح معلوم ہے۔

اور جو کچھ آسمان سے اُترتا ہے اور جو کچھ اُس میں چڑھتا ہے، ہر چیز کو وہ جانتا ہے، وہ رحیم اور غفور ہے۔[۴]

منکرین کہتے ہیں کیا بات ہے کہ قیامت ہم پر نہیں آرہی ہے[۵]! کہو، قسم ہے میرے عالم الغیب پروردگار کی، وہ تم پر آکر رہے گی[۶]۔ اُس سے ذرہ برابر کوئی چیز نہ آسمانوں میں چھپی ہوئی ہے نہ زمین میں، نہ ذرے سے بڑی اور نہ اُس سے چھوٹی، سب کچھ ایک نمایاں دفتر میں درج ہے[۷]۔ اور یہ قیامت اس لیے آئے گی کہ جزا دے اللہ اُن لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں اور نیک عمل کرتے رہے ہیں، اُن کے لیے

---

۴ یعنی ایسا نہیں ہے کہ اس کی سلطنت میں اگر کوئی شخص یا گروہ اس کے خلاف بغاوت کرنے کے باوجود پکڑا نہیں جا رہا ہے تو اس کی وجہ یہ ہو کہ یہ دنیا اندھیر نگری اور اللہ تعالیٰ اس کا چوپٹ راجہ ہے، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ رحیم ہے اور درگزر سے کام لینا اس کی عادت ہے۔ عاصی اور خاطی کو قصور سرزد ہوتے ہی پکڑ لینا، اس کا رزق بند کر دینا، اس کے جسم کو مفلوج کر دینا، اس کو آناً فاناً ہلاک کر دینا، سب کچھ اس کے قبضۂ قدرت میں ہے، مگر وہ ایسا کرتا نہیں ہے۔ یہ اس کی شانِ رحیمی کا تقاضا ہے کہ قادرِ مطلق ہونے کے باوجود وہ نافرمان بندوں کو ڈھیل دیتا ہے، سنبھلنے کی مہلت عطا کرتا ہے، اور جب بھی وہ باز آجائیں، معاف کر دیتا ہے۔

۵ یہ بات وہ طنز اور تمسخر کے طور پر خَیدرا چَیدرا کر کہتے تھے۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ بہت دنوں سے یہ پیغمبر صاحب قیامت کے آنے کی خبر سنا رہے ہیں، مگر کچھ خبر نہیں کہ وہ آتے آتے کہاں رہ گئی۔ ہم نے اتنا کچھ انہیں جھٹلایا، اتنی گستاخیاں کیں، ان کا مذاق تک اڑایا، مگر وہ قیامت ہے کہ کسی طرح نہیں آچکتی۔

۶ پروردگار کی قسم کھاتے ہوئے اس کے لیے "عالم الغیب" کی صفت استعمال کرنے سے خود بخود اس امر کی طرف اشارہ ہو گیا کہ قیامت کا آنا تو یقینی ہے مگر اس کے آنے کا وقت خدائے عالم الغیب کے سوا کسی کو معلوم نہیں ہے۔ یہی مضمون قرآن مجید میں مختلف مقامات پر مختلف طریقوں سے بیان ہوا ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، تفسیر سورۂ احزاب، حاشیہ نمبر ۱۱۶۔

۷ یہ امکانِ آخرت کے دلائل میں سے ایک دلیل ہے۔ جیسا کہ آگے آیت نمبر ۷ میں آ رہا ہے، منکرینِ آخرت جن وجوہ سے زندگی بعد موت کو بعید از عقل سمجھتے تھے ان میں سے ایک بات یہ بھی تھی کہ جب سارے

مغفرت ہے اور رزقِ کریم۔ اور جن لوگوں نے ہماری آیات کو نیچا دکھانے کے لیے زور لگایا ہے، ان کے لیے بدترین قسم کا دردناک عذاب ہے۔[ش۶] اے نبی، علم رکھنے والے خوب جانتے ہیں کہ جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے نازل کیا گیا ہے وہ سراسر حق ہے اور خدائے عزیز و حمید کے راستے کی طرف ہدایت

انسان مر کر مٹی میں رل مل جائیں گے اور ان کا ذرّہ ذرّہ منتشر ہو جائے گا تو کس طرح یہ ممکن ہے کہ یہ بے شمار اجزاء بچھڑے اکٹھے ہوں اور ان کو جوڑ کر ہم دوبارہ اپنے اِنہی اجسام کے ساتھ پیدا کر دیے جائیں۔ اس شبہ کو یہ کہہ کر رفع کیا گیا ہے کہ ہر ذرّہ جو کہیں گیا ہے، خدا کے دفتر میں اس کا اندراج موجود ہے اور خدا کو معلوم ہے کہ کیا چیز کہاں گئی ہے۔ جب وہ دوبارہ پیدا کرنے کا ارادہ کریگا تو اسے ایک ایک انسان کے اجزائے جسم کو سمیٹ لانے میں کوئی زحمت پیش نہ آئے گی۔

ش۵ اوپر آخرت کے امکان کی دلیل تھی، اور یہ اس کے وجوب کی دلیل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایسا وقت ضرور آنا ہی چاہیے جب ظالموں کو ان کے ظلم کا اور صالحوں کو ان کی نیکی کا بدلہ دیا جائے۔ عقل یہ چاہتی ہے اور انصاف یہ تقاضا کرتا ہے کہ جو نیکی کرے اسے انعام ملے اور جو بدی کرے وہ سزا پائے۔ اب اگر تم دیکھتے ہو کہ دنیا کی موجودہ زندگی میں نہ ہر بد کو اس کی بدی کا اور نہ ہر نیک کو اس کی نیکی کا پورا بدلہ ملتا ہے، بلکہ بسا اوقات بدی اور نیکی کے اُلٹے نتائج بھی نکل آتے ہیں، تو تمہیں تسلیم کرنا چاہیے کہ عقل اور انصاف کا یہ لازمی تقاضا کسی وقت ضرور پورا ہونا چاہیے۔ قیامت اور آخرت اُسی وقت کا نام ہے۔ اس کا آنا نہیں بلکہ نہ آنا عقل کے خلاف اور انصاف سے بعید ہے۔

اس سلسلہ میں ایک اور نکتہ بھی اوپر کی آیات سے واضح ہوتا ہے۔ ان میں بتایا گیا ہے کہ ایمان اور عملِ صالح کا نتیجہ مغفرت اور رزقِ کریم ہے۔ اور جو لوگ خدا کے دین کو نیچا دکھانے کے لیے معاندانہ جدوجہد کریں ان کے لیے بدترین قسم کا عذاب ہے۔ اس سے خود بخود یہ ظاہر ہو گیا کہ جو شخص سچے دل سے ایمان لائے گا اس کے عمل میں، اگر کچھ خرابی بھی ہو تو وہ رزقِ کریم چاہے نہ پائے مگر مغفرت سے محروم نہ رہے گا۔ اور جو شخص کافر تو ہو مگر دینِ حق کے مقابلے میں عناد و مخالفت کی روش بھی اختیار نہ کرے وہ عذاب سے تو نہ بچے گا مگر بدترین عذاب اس کے لیے نہیں ہے۔

دینے والا ہے۹۔

منکرین لوگوں سے کہتے ہیں " ہم بتائیں تمہیں ایسا شخص جو خبر دیتا ہے کہ جب تمہارے جسم کا ذرہ ذرہ منتشر ہو چکا ہوگا اس وقت تم نئے سرے سے پیدا کر دیے جاؤ گے ؟ نہ معلوم یہ شخص اللہ کے نام سے جھوٹ گھڑتا ہے یا اسے جنون لاحق ہے۱۰"

نہیں، بلکہ جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے وہ عذاب میں مبتلا ہونے والے ہیں اور وہی بُری طرح بہکے ہوئے ہیں۱۱۔ کیا اِنہوں نے کبھی اُس آسمان و زمین کو نہیں دیکھا جو اِنہیں آگے اور پیچھے سے

---

۹ یعنی یہ معاندین تمہارے پیش کردہ حق کو باطل ثابت کرنے کے لیے خواہ کتنا ہی زور لگائیں، ان کی یہ تدبیریں کامیاب نہیں ہو سکتیں، کیونکہ ان باتوں سے وہ جہلا ہی کو دھوکا دے سکتے ہیں۔ علم رکھنے والے لوگ ان کے فریب میں نہیں آتے۔

۱۰ قریش کے سردار اس بات کو خوب جانتے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جھوٹا تسلیم کرنا عوام الناس کے لیے سخت مشکل ہے، کیونکہ ساری قوم آپ کو صادق القول جانتی تھی اور کبھی ساری عمر کسی نے آپ کی زبان سے کوئی جھوٹی بات نہ سُنی تھی۔ اس لیے وہ لوگوں کے سامنے اپنا الزام اس شکل میں پیش کرتے تھے کہ یہ شخص جب زندگی بعد موت جیسی اَنہونی بات زبان سے نکالتا ہے تو لامحالہ اس کا معاملہ دو حال سے خالی نہیں ہو سکتا۔ یا تو (معاذ اللہ) یہ شخص جان بوجھ کر ایک جھوٹی بات کہہ رہا ہے، یا پھر یہ مجنون ہے۔ لیکن یہ مجنون والی بات بھی اتنی ہی بے سروپا تھی جتنی جھوٹ والی بات تھی۔ اس لیے کہ کوئی عقل کا اندھا ہی ایک کمال درجہ کے عاقل و فہیم آدمی کو مجنون مان سکتا تھا۔ ورنہ آنکھوں دیکھتے کوئی شخص جیتی مکھی کیسے نگل لیتا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس بیہودہ بات کے جواب میں کسی استدلال کی ضرورت محسوس نہ فرمائی اور کلام صرف ان کے اس اچنبھے پر کیا جو زندگی بعد موت کے امکان پر وہ ظاہر کرتے تھے۔

۱۱ یہ ان کی بات کا پہلا جواب ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نادانو، عقل تو تمہاری ماری گئی ہے کہ جو شخص حقیقتِ حال سے تمہیں آگاہ کر رہا ہے اس کی بات نہیں مانتے اور بگٹٹ اس راستے پر

گھیرے ہوئے ہے؟ ہم چاہیں تو انہیں زمین میں دھسا دیں، یا آسمان کے کچھ ٹکڑے اِن پر گرا دیں۔ [۱۲]

چلے جا رہے ہو جو سیدھا جہنّم کی طرف جاتا ہے، مگر تمہاری حماقت کی طغیانی کا عالم یہ ہے کہ اُلٹا اُس شخص کو مجنون کہتے ہو جو تمہیں بچانے کی فکر کر رہا ہے۔

[۱۲] یہ ان کی بات کا دوسرا جواب ہے۔ اس جواب کو سمجھنے کے لیے یہ حقیقت نگاہ میں رہنی چاہیے کہ کفارِ قریش جن وجوہ سے زندگی بعد موت کا انکار کرتے تھے ان میں تین چیزیں سب سے زیادہ نمایاں تھیں۔ ایک یہ کہ وہ خدا کے محاسبے اور بازپرس کو نہیں ماننا چاہتے تھے کیونکہ اسے مان لینے کے بعد دنیا میں من مانی کرنے کی آزادی ان سے چھن جاتی تھی۔ دوسرے یہ کہ وہ قیامت کے وقوع اور نظامِ عالم کے درہم برہم ہو جانے اور پھر سے ایک نئی کائنات بننے کو ناقابلِ تصوّر سمجھتے تھے۔ تیسرے یہ کہ جن لوگوں کو مرے ہوئے سینکڑوں ہزاروں برس گزر چکے ہوں اور جن کی ہڈیاں تک ریزہ ریزہ ہو کر زمین، ہوا اور پانی میں پراگندہ ہو چکی ہوں، ان کا دوبارہ جسم و جان کے ساتھ جی اٹھنا ان کے نزدیک بالکل بعید از امکان تھا۔ اوپر کا جواب ان تینوں پہلوؤں پر حاوی ہے، اور مزید براں اس میں ایک سخت تنبیہ بھی مضمر ہے۔ ان مختصر سے فقروں میں جو مضمون بیان کیا گیا ہے اس کی تفصیل یہ ہے:

(۱) اس زمین و آسمان کو اگر کبھی تم نے آنکھیں کھول کر دیکھا ہوتا تو تمہیں نظر آتا کہ یہ کوئی کھلونا نہیں ہے، اور نہ یہ نظام اتفاقاً بن گیا ہے۔ اس کائنات کی ہر چیز اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ اسے ایک قادرِ مطلق ہستی نے کمال درجہ حکمت کے ساتھ بنایا ہے۔ ایسے ایک حکیمانہ نظام میں یہ تصوّر کرنا کہ یہاں کسی کو عقل و تمیز اور اختیارات عطا کرنے کے بعد اسے غیر ذمہ دار اور غیر جواب دہ چھوڑا جا سکتا ہے، سراسر ایک لغو بات ہے۔

(۲) اس نظام کو جو شخص بھی دیدۂ بینا کے ساتھ دیکھے گا اسے معلوم ہو جائیگا کہ قیامت کا آجانا کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔ زمین اور آسمان جن بندشوں پر قائم ہیں ان میں ایک ذرا سا اُلٹ پھیر بھی ہو جائے تو آناً فاناً قیامت برپا ہو سکتی ہے۔ اور یہی نظام اس بات پر بھی گواہ ہے کہ جس نے آج یہ دنیا بنا رکھی ہے وہ ایک دوسری دُنیا پھر بنا سکتا ہے۔ اس کے لیے ایسا کرنا مشکل ہوتا تو یہی دنیا کیسے بن کھڑی ہوتی۔

درحقیقت اس میں ایک نشانی ہے ہر اُس بندے کے لیے جو خدا کی طرف رجوع کرنے والا ہو۔[۱۱] ع۱

(۴) تم نے آخر خالق ارض و سما کو کیا سمجھ رکھا ہے کہ مرے ہوئے انسانوں کے دوبارہ پیدا کیے جانے کو اس کی قدرت سے باہر خیال کر رہے ہو۔ جو لوگ مرتے ہیں ان کے جسم پارہ پارہ ہو کر خواہ کتنے ہی منتشر ہو جائیں، رہتے تو اسی زمین و آسمان کے حدود میں ہیں۔ اس سے کہیں باہر تو نہیں چلے جاتے۔ پھر جس خدا کے یہ زمین و آسمان ہیں اس کے لیے کیا مشکل ہے کہ مٹی اور پانی اور ہوا میں جو چیز جہاں بھی ہے اسے وہاں سے نکال لائے۔ تمہارے جسم میں اب جو کچھ موجود ہے وہ بھی تو اسی کا جمع کیا ہوا ہے اور اسی مٹی، ہوا اور پانی میں سے نکال کر لایا گیا ہے۔ ان اجزاء کی فراہمی اگر آج ممکن ہے تو کل کیوں غیر ممکن ہو جائے گی۔

ان تین دلیلوں کے ساتھ اس کلام میں یہ تنبیہ بھی پوشیدہ ہے کہ تم ہر طرف سے خدا کی خدائی میں گھرے ہوئے ہو۔ جہاں بھی جاؤ گے یہی کائنات تم پر محیط ہو گی۔ خدا کے مقابلے میں کوئی جائے پناہ تم نہیں پا سکتے۔ اور خدا کی قدرت کا حال یہ ہے کہ جب وہ چاہے تمہارے قدموں کے نیچے یا سر کے اوپر سے جو بلا چاہے تم پر نازل کر سکتا ہے۔ جس زمین کو آغوشِ مادر کی طرح تم اپنے لیے جائے سکون پاتے ہو اور اطمینان سے اس پر گھر بنائے بیٹھے ہو، تمہیں کچھ پتہ نہیں کہ اس کی سطح کے نیچے کیا قوتیں کام کر رہی ہیں اور کب وہ کوئی زلزلہ لا کر اسی زمین کو تمہارے لیے مرقد بنا دیتی ہیں۔ جس آسمان کے نیچے تم اس اطمینان کے ساتھ چل پھر رہے ہو گویا کہ یہ تمہارے گھر کی چھت ہے، تمہیں کیا معلوم کہ اسی آسمان سے کب کوئی بجلی گر پڑتی ہے، یا ہلاکت خیز بارش ہو جاتی ہے، یا اور کوئی ناگہانی آفت آ جاتی ہے۔ اس حالت میں تمہاری خدا سے یہ بے خوفی اور فکرِ عاقبت سے تمہاری یہ غفلت اور ایک خیر خواہ کی نصیحت کے مقابلہ میں تمہاری بیہودہ گوئی بجز اس کے اور کیا معنی رکھتی ہے کہ تم اپنی شامت ہی کو دعوت دے رہے ہو۔

[۱۱] یعنی جو شخص کسی قسم کا تعصب نہ رکھتا ہو، جس میں کوئی ہٹ دھرمی اور ضد نہ پائی جاتی ہو، بلکہ جو اخلاص کے ساتھ اپنے خدا سے طالب ہدایت ہو، وہ تو آسمان و زمین کے اس نظام کو دیکھ کر بڑے سبق لے سکتا ہے۔ لیکن جس کا دل خدا سے پھرا ہوا ہو وہ کائنات میں سب کچھ دیکھے گا مگر حقیقت کی طرف اشارہ کرنے والی کوئی نشانی اسے سجھائی نہ دے گی۔

ہم نے داؤد کو اپنے ہاں سے بڑا فضل عطا کیا تھا۔[۱۴] (ہم نے حکم دیا کہ) اے پہاڑو، اس کے ساتھ ہم آہنگی کرو (اور یہی حکم ہم نے) پرندوں کو دیا۔[۱۵] ہم نے لوہے کو اس کے لیے نرم کر دیا اس ہدایت کے ساتھ کہ زرہیں بنا اور ان کے حلقے ٹھیک اندازے پر رکھ۔[۱۶] (اے آل داؤد) نیک عمل کرو، جو کچھ تم کرتے ہو اس کو میں دیکھ رہا ہوں۔

---

۱۴ اشارہ ہے اُن بے شمار عنایات کی طرف جن سے اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو نوازا تھا۔ وہ بیت اللحم کے رہنے والے قبیلۂ یہوداہ کے ایک معمولی نوجوان تھے۔ فلستیوں کے خلاف ایک معرکے میں جالوت جیسے گرانڈیل دشمن کو قتل کر کے یکایک وہ بنی اسرائیل کی آنکھوں کا تارا بن گئے۔ اسی واقعہ سے ان کا عروج شروع ہوا یہاں تک کہ طالوت کی وفات کے بعد پہلے وہ حبرون (موجودہ الخلیل) میں یہودیہ کے فرمانروا بنائے گئے، پھر چند سال بعد تمام قبائل بنی اسرائیل نے مل کر ان کو اپنا بادشاہ منتخب کیا، اور انہوں نے یروشلم کو فتح کر کے اسے دولتِ اسرائیل کا پایۂ تخت بنایا۔ یہ انہی کی قیادت تھی جس کی بدولت تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک ایسی خدا پرست سلطنت وجود میں آئی جس کے حدود خلیج عقبہ سے دریائے فرات کے مغربی کناروں تک پھیلے ہوئے تھے۔ اِن عنایات پر مزید وہ فضل خداوندی ہے جو علم و حکمت، عدل و انصاف، اور خدا ترسی و بندگیٔ حق کی صورت میں ان کو نصیب ہوا۔ (تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد اول ص ۱۹۱۔ جلد دوم ص ۵۹۵ تا ۵۹۸)

۱۵ یہی مضمون سورۂ انبیاء آیت ۷۹ میں گزر چکا ہے اور وہاں ہم اس کی تشریح کر چکے ہیں۔
(ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد سوم۔ ص ۱۷۴۔۱۷۵)

۱۶ یہ مضمون بھی سورۂ انبیاء آیت ۸۰ میں گزر چکا ہے اور وہاں اس کی تشریح کی جا چکی ہے۔
(ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد سوم ص ۱۷۵۔۱۷۶)

فوجی حکومت کے ثمرات

مصر کے موجودہ حالات کا جائزہ

از سید میر غنی سوڈانی

یہ مضمون سوڈان کی معروف شخصیت سید میر غنی عبدالحمید کا لکھا ہوا ہے۔ اور مکہ کے روزنامہ "الندوہ" میں (۳۱ر دسمبر ۱۹۶۱ء کو) شائع ہوا ہے۔ سید میر غنی سوڈان کی سب سے بااثر مذہبی جماعت "الختمیہ" کے پیشوا ہیں۔ سیاسی طور پر سید موصوف پہلے سوڈان اور مصر کے ادغام کے حامی تھے۔ اور "اشقہ" پارٹی کے پشت پناہ تھے۔ جو وادیٔ نیل کے اتحاد کی علمبردار تھی۔ اس کے مقابلے میں سوڈان کی دوسری سیاسی جماعتیں سوڈان کی خودمختاری اور استقلال کی حامی تھیں۔ اور سوڈان کی دوسری بڑی مذہبی جماعت "طائفۃ الانصار" (جس کے موجودہ رہنما صدیق المہدی ہیں) بھی ان کی ہمنوا تھی۔ مگر اب مصر کے حالات و تجربات کے بعد سید میر غنی اپنے موقف کو تبدیل کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں سوڈان میں جمال عبدالناصر کا سب سے پرجوش حامی بھی ان کا مخالف ہو گیا ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

سید موصوف رجب ۱۳۸۱ھ کو عمرہ و زیارت کے لیے بلادِ مقدسہ تشریف لائے تھے زیرِ نظر مضمون اسی سفر کے دوران میں انہوں نے تحریر کیا ہے مضمون کے آغاز میں لکھتے ہیں کہ "مصر کے حالات پر سوڈان کے لوگ بڑی تشویش میں مبتلا ہیں اور ہر وقت انکی زبانوں پر پڑوسی ملک کا چرچا رہتا ہے۔ یہاں ارضِ مقدسہ میں مجھے متعدد مصری زائرین اور یہاں کے مقیم مصری باشندوں سے ملنے کا موقع ملا ہے۔ ان لوگوں کی زبان سے مصر

کے جو حالات سننے میں آئے ہیں، نیز مصری ریڈیو اور مصری اخبارات سے وہاں کی جو خبریں معلوم ہوتی رہتی ہیں، انہیں سن کر کوئی عرب یا غیر عرب مسلمان ایسا نہیں ہوگا جو مصر اور اہلِ مصر پر خون کے آنسو روئے بغیر رہ سکے۔ غ۔ح)

مجھے یاد ہے کہ جمال عبدالناصر نے جب ۲۳ جولائی ۱۹۶۱ء کی شام کو قاہرہ ریڈیو سے تقریر کرتے ہوئے اپنی "سوشل اصلاحات" کا اعلان کیا تھا تو اس تقریر میں کہا تھا: "اگر ہم سے یہ دریافت کیا جائے کہ سوشل احکام و اقدامات کی آخری حد کیا ہوگی؟ تو ہمارا جواب یہ ہے کہ ہمیں ان کی کوئی حد معلوم نہیں ہے" جمال عبدالناصر کے ان الفاظ سے ہمارا ماتھا اُسی وقت ٹھنکا اور ہمیں اندیشہ ہوگیا کہ اب یہ مسکین مصری قوم بے پناہ آلام و مصائب کے نرغے میں آنے والی ہے۔ چنانچہ بعد کے واقعات نے ہماری پیشنگوئی کی تصدیق کردی اور وہ تمام قیاسات بھی درست ثابت ہونے لگے جو دوسرے لوگوں نے فوجی انقلاب کے اوائل یعنی ۱۹۵۲ء ہی میں ظاہر کردیے تھے۔ اور بالآخر یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ یہ لوگ اس معاملہ میں مجھ سے زیادہ باریک بین تھے، انقلاب کے رُخ کو مجھ سے بہتر سمجھنے والے تھے اور میری طرح ان نمائشی کاموں سے دھوکا کھانے والے نہیں تھے جو شروع شروع میں انقلاب برپا کرنے والوں نے سرانجام دیے تھے۔[1]

فوجی حکام کے ابتدائی کارنامے انقلاب مصر کے ابتدائی ایام میں مَیں مصر میں تھا۔ مجھے یاد ہے کہ انقلابی جماعت کے ابتدائی کارنامے بڑے قابلِ تعریف تھے۔ ان دنوں انقلابی حکومت نے پہلا حکم یہ جاری کیا تھا کہ تمام سرکاری دفاتر اور تمام غیر سرکاری اداروں سے شاہ فاروق کی تصویر اُتار دی جائے اور اس کے بجائے بڑے بڑے چوکھٹوں میں "اللہ" کا لفظ کندہ کرکے دیواروں پر آویزاں کیا جائے۔ پھر یہ حکم جاری ہوا کہ کسی ادارے کی طرف سے، خواہ وہ سرکاری ہو یا غیر سرکاری، کوئی

---

[1] سید میر غنی کا یہ اشارہ اپنے اس موقف کی طرف ہے جو انہوں نے برسوں تک سوڈان اور مصر کے اتحاد کے حق میں اختیار کیے رکھا۔ (م)

کتاب ایسی نہ شائع کی جائے جس کا آغاز "بسم اللہ الرحمان الرحیم" سے نہ کیا گیا ہو۔ اور جس میں عیسوی تاریخ سے پہلے ہجری تاریخ نہ لکھی گئی ہو۔ انقلابی کونسل کے بعض ارکان ایسے بھی تھے جو جمعہ کا خطبہ دیتے تھے اور ہزاروں کے مجمع کی امامت کرتے تھے۔ انور سادات اور حسین شافعی انہی لوگوں میں سے تھے۔ اور جب اخوان المسلمون کے رہنما امام حسن البنّاؒ کا یومِ شہادت آیا تو تمام کرنلوں اور جرنلوں کی زبانیں اور قلم امام موصوف کی مدح و ستائش کے لیے وقف ہوگئے۔ حکومت کی طرف سے اُن لوگوں کے لیے عام معافی کا اعلان ہوگیا، جن کو سابقہ حکومتوں نے انتقامی جذبات کے تحت جیلوں میں ڈال رکھا تھا۔

انقلابی حکومت اصل روپ میں

اس کے بعد میں اور میرے دوسرے ساتھی مصر کے حالات کا بغور جائزہ لیتے رہے۔ چنانچہ ہمارے دیکھتے دیکھتے دو متضاد رجحانات اُبھر آئے جو حکومت کے متضاد اقدامات میں صاف محسوس ہونے لگے۔ مثلاً ایک طرف صدر (جنرل محمد نجیب) اور ان کے رفقاء بڑے پُرشکوہ جلوس کی معیت میں جمعہ کی نماز ادا کرتے ہیں اور دوسری طرف شرعی عدالتوں کی تنسیخ کا آرڈیننس جاری ہوتا ہے۔ پھر کچھ مدّت کے بعد انقلابی حکومت اور اخوان المسلمون کے مابین اختلافات جنم لیتے ہیں جو بالآخر اخوان کی عبرت ناک سزا پر منتج ہوتے ہیں۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ جس "انقلاب" کا یہ فخریہ دعویٰ تھا کہ وہ "پُرامن" اور "غیر خونی" ہے، وہی انقلاب مسلمانوں کا خون اپنے لیے مُباح کر لیتا ہے۔ اور اس کی ایک فوجی عدالت بے دریغ اخوان کے چھ رہنماؤں کو تختۂ دار پر کھینچ دینے کا فیصلہ کر دیتی ہے۔ اور عدالتی کارروائی کے دوران عدالت کا صدر جمال سالم[1] ایسے نازیبا الفاظ زبان سے نکالتا ہے جو اللہ اور اُس کے رسول اور اس کی کتاب کے ساتھ صریح گستاخی بلکہ نہایت رکیک تمسخر پر مبنی ہوتے ہیں۔ انقلابی کونسل جمال عبدالناصر کی سربراہی میں سزائے موت کے فیصلے کی توثیق کر دیتی ہے۔ اور مسلمانوں

---

[1] جمال سالم اور اس کا بھائی صلاح سالم دونوں اخوان کو سزائیں دینے میں پیش پیش تھے۔ کرنل ناصر نے جمال سالم کو کچھ عرصہ کے بعد حکومت سے الگ کر دیا۔ اور صلاح سالم کو بھی وزارتِ ارشاد سے اُٹھا کر الجمہوریہ اخبار کی سرپرستی دے دی گئی۔ اب چند روز ہوئے اخبارات میں یہ خبر آچکی ہے کہ صلاح سالم کا انتقال ہو گیا ہے۔ اِنَّ اللہَ یُمھِل ولا یُھمِل (خدا کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں ہے)

کے خون بہا دینے میں کوئی حرج محسوس نہیں کرتی۔ حالانکہ اس کونسل کے ارکان مسلمانوں کی نمازوں کی امامت کرتے رہے ہیں اور خطبات جمعہ میں "قال اللہ" اور "قال الرسول" سے کم بات نہیں کرتے تھے۔

یہی جمال سالم جو اپنے چھ دینی اور وطنی بھائیوں کو پھانسی پر لٹکاتا ہے تین سال کے بعد ارضِ مقدس کا سفر کرتا ہے۔ حج اور عمرہ کرتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ مبارکہ کی زیارت کرتا ہے۔ اور بالآخر اس کے بارے میں ہمیں آخری خبر یہ ملتی ہے کہ وہ بڑا زاہد و عابد اور شب بیدار ہو گیا ہے۔ جمال سالم سے پہلے خود صدر ناصر بھی بلادِ مقدسہ کا رُخ کرتا ہے۔ بیت اللہ کا طواف کرتا ہے۔ صفا و مروہ کے مابین سعی کرتا ہے۔ اور مسجد حرام اور مسجد نبوی میں رو رو کر دعائیں کرتا ہے[1]۔

خدا کی ناشکری جب ۱۹۵۶ء میں برطانیہ، فرانس اور اسرائیل نے مل کر نہر سویز پر حملہ کیا تھا تو حملہ کی خبر سنتے ہی جمال عبدالناصر کو خدا یاد آیا۔ اور ازہر کی جامع مسجد میں آ کر فوراً بارگاہِ خداوندی میں سجدہ ریز ہوا، اور اس بلا کو رد کرنے کے لیے اللہ سے گریہ وزاری کی۔ لوگوں نے بھی اس کے ساتھ مل کر دُعائیں کیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے دُعاؤں کو قبول کیا اور حملہ آوروں کو شکست کھانا پڑی۔ یہ اللہ کا بڑا کرم تھا۔ خود اللہ کا ارشاد ہے کہ "جب کوئی مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی پکار کو سنتا ہوں"۔

بے شک جمال عبدالناصر نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد سنا ہو گا کہ:

لئن شکرتم لازیدنکم ولئن کفرتم ان عذابی لشدید۔	اگر تم شکر ادا کرو گے تو مزید دوں گا اور اگر تم نے ناشکری کی تو میرا عذاب بھی بڑا سخت ہے۔

کیا صدر ناصر نے شکر کا مسلک اختیار کیا ہے کہ اللہ اس پر مزید عنایات کرتا؟ کیا اللہ تعالیٰ کے شکر کا طریقہ یہ ہے کہ اللہ کے احکام کو منسوخ کر دیا جائے اور محکوم رعایا کے رزق کی راشن بندی کر دی جائے؟ یہ کام کسی ارضی حکمران کے شایانِ شان نہیں ہے۔ اور نہ کسی آسمانی مذہب نے اس کی اجازت دی ہے۔ بلکہ بُت پرست مذاہب بھی اس کے قائل نہیں ہیں۔ یہ صرف ملحد اور خدا کی باغی حکومتوں کی سنّتِ سیئہ ہے۔

---

[1] اسی طرح یہ بھی کیا کم افسوسناک بات ہے کہ پہلے روضۂ نبوی پر جا کر عشقِ رسول کے نام پر زار و قطار رویا جائے اور اس کے فوراً بعد انڈونیشیا پہنچ کر نوجوان لڑکیوں کے بالی رقص سے سفر کی تھکاوٹ دور کی جائے۔ اس سے بڑھ کر خدا اور اس کے رسول کے ساتھ کیا مذاق ہو گا۔ العیاذ باللہ۔

اہلِ دین کی تضحیک آسمانی احکام کو منسوخ کرنے والا قانون یعنی قانون تحدید ملکیت جس روز سے جاری کیا گیا ہے اُس روز سے علمائے دین کی تضحیک و توہین کا دروازہ کھُل گیا ہے چنانچہ ۲۳ جولائی ۱۹۶۱ء کو صدر ناصر نے اپنے اشتراکی قوانین کا اعلان کرنے کے بعد جو تقریر کی ہے اُس میں علمائے دین کی خوب خبر لی ہے۔ اور نصیحت کی ہے کہ ان قوانین کے خلاف انہیں کسی قسم کا شرعی فتویٰ صادر کرنے کا حق نہیں ہے۔ بلکہ ایسا فتویٰ دینے والوں کے بارے میں پیشگی یہ اطلاع دی ہے کہ "یہ وہ لوگ ہیں جو جاگیردارانِ رجعت پسند وں، استعماری ایجنٹوں اور فلاں اور فلاں کے دسترخوانوں پر جاکر مرغ اُڑانے کے عادی ہیں"۔

علماء پر جبر و تشدد شام کے مفتی اعظم شیخ ابو الیُسر عابدین صدر ناصر کے "انقلابی قوانین" ــــ یا "اشتراکی قوانین" ــــ کے بارے میں کلمۂ حق کہنے کی پاداش میں اپنے منصب سے برطرف کر دیے گئے اور انہیں جیل میں ڈال دیا گیا۔ مصری علماء کی معتد بہ تعداد کا بھی یہی حشر ہو چکا ہے۔ اور بعض علماء کو یا زیادہ صحیح لفظوں میں چند کمزور اور معمولی مولویوں کو مجبور کیا گیا کہ وہ یہ فتویٰ دیں کہ مالداروں کے قبضہ سے ان کی دولت کو قومی ملکیت یا زرعی اصلاحات کے نام سے چھین لینا عین اسلام ہے۔ یہ بیچارہ گروہ سر پر تلوار لٹکتی دیکھ کر مجبور ہو گیا کہ حکمِ حاکم کو بجا لائے، دین میں تحریف کرے، رسول پر دروغ گوئی کرے اور خاص طور پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شخصیت کو افترا پردازی کا نشانہ بنا لئے۔

مصری قوم کا شدید ابتلاء شام تو "سوشلزم" کی آزمائش سے جان بچا گیا۔ اب غیظ و غضب کے تمام پہاڑ صرف مصریوں پر ٹوٹ رہے ہیں۔ جب حکومت کا یہ فرمان جاری ہوا کہ ہر وہ شخص جو مالدار ہے یا مالداروں جیسا ہے چور ہے۔ تو اس فرمان کے صادر ہوتے ہی بڑے بڑے لوگوں کی جائدادوں پر قبضہ کر لیا گیا اور انہیں جیل خانہ پہنچا دیا گیا۔ اس سلسلے میں عجیب خبر یہ سُنی ہے کہ سراج الدین اور ان کے ساتھیوں کو بھی دوبارہ جیل بھیج دیا گیا ہے۔ حالانکہ ایک سال قبل انہیں صدر کی عام معافی کے تحت رہا کیا گیا تھا۔ اور اُن کے خلاف جو احکام جاری کئے گئے تھے اُنہیں واپس لے لیا گیا تھا۔ اب یہ بات سمجھ سے بالا ہے کہ جس حکم کو خود صدر منسوخ کر دیتا ہے اُسے پھر کیوں نافذ کر دیا جاتا ہے۔

سوشل بائیکاٹ کی مہم اب حال ہی میں "سوشل بائیکاٹ" کا نظریہ ایجاد کیا گیا ہے۔ اس نظریہ

کی رُو سے حکومت جن لوگوں کو "دشمن قوم" قرار دیتی ہے انہیں نہ صرف ان کی جائدادوں اور املاک سے محروم کر دیا جاتا ہے بلکہ اُن سے ہر طرح کی اجتماعی سرگرمیوں میں مشارکت کا حق چھین لیا جاتا ہے۔ اس مہم کی زد میں جو لوگ آچکے ہیں اُن میں بڑے بڑے جج، وکلاء، ڈاکٹر اور وہ لوگ جو اسلام اور عربوں کی قابلِ تعریف خدمات سرانجام دے چکے ہیں شامل ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ ان میں سے ہر شخص صاحبِ اہل و عیال ہے، اس کے اعزّا و اقارب ہیں، دوست اور ہمسائے ہیں۔ کیا ان لوگوں کو رشتہ داروں سے اور عام ملکی معاشرے سے کاٹ پھینکنا درست ہے؟ کیا اس طرح سے صلہ رحمی کی بنیادیں نہیں منہدم ہونگی اور لوگوں کے اندر باہمی مودت و رحمت کے جذبات نہیں محو ہوں گے؟

املاک کی ضبطی میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ یہ "قانون ضبطیٔ املاک" جس نے تمام شہری جائدادوں کو اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے اس کی کیا حقیقت ہے؟ اور شہری املاک کو ضبط کرنے والے کون لوگ ہیں؟ کیا یہ ضبطی مستقل ہے یا عارضی؟ اگر عارضی ہے تو کتنی مدّت تک کے لئے ہے؟ ضبطیٔ املاک کے احکام سے مصر صرف پچھلی دو عالمی جنگوں، جنگِ فلسطین اور مصر پر سہ طاقتی حملہ کے دوران روشناس ہوا ہے۔ لیکن اس وقت ان احکام کا اطلاق بھی صرف دشمن عناصر یہودیوں، فرانسیسیوں اور انگریزوں کے اموال تک محدود ہوتا تھا۔ اور جب جنگی حالات اور بحرانی کیفیات ختم ہو جاتی تھیں تو ضبط شدہ اموال اصل مالکوں کو واپس مل جاتے تھے۔ اور وہ بھی اس انداز کے ساتھ کہ دشمن ملکوں کے نمایندوں کی وساطت سے ضبط شدہ اموال کا پائی پائی حساب کیا جاتا تھا۔ لیکن اب جن جائیدادوں پر "ضبطی املاک" کا قانون نافذ کیا گیا ہے یہ باشندگانِ ملک کی جائیدادیں ہیں۔ ان کو غیر معین مدت تک ضبط کرنے کی کیا وجہ ہے؟ کیا اصل مقصد ان کی کامل ضبطی تو نہیں ہے؟ یہی اعتراض املاک کی نیشنلائزیشن پر اور ناروا طور پر زرعی املاک کی تحدید پر وارد ہوتا ہے۔

غیر ملکی سرمائے پر دست درازیاں صدر جمال عبدالناصر نے اپنے واضح بیانات میں اور بڑے بڑے عالمی جرائد کے نمائندوں کے سامنے اپنی گفتگوؤں میں بار بار یہ اعلان کیا تھا کہ مصر غیر ملکی سرمائے کا خیر مقدم کرے گا اور اس کی پوری حفاظت کرے گا۔ چنانچہ غیر ملکی سرمایہ داروں نے صدر ناصر کے

قول پر اعتماد کرتے ہوئے ہزاروں ملین روپیہ عمارتوں، ٹریڈ کمپنیوں اور صنعتی اسکیموں کی صورت میں مصر میں جھونک دیا۔ کیا صدر ناصر کی یہ تیقین دہانیاں غیر ملکی سرمائے کو ہڑپ کرنے کے لئے محض ایک فریب تھیں ؟ "سوشل اصلاحات" سے متعلق حالیہ قوانین سے صدر ناصر کی اسی فریب کاری کا ثبوت ملتا ہے۔ ان ظالمانہ قوانین میں سے ایک "قانون متزاید محصول" (Rate of taxation progressive) ہے۔ اس قانون نے بعض مالکانِ مکانات کی آمدنی چالیس ہزار پونڈ اور ایک لاکھ پونڈ سالانہ سے گھٹا کر پانچ ہزار پونڈ تک گرادی ہے۔ اور ان پانچ ہزار پاؤنڈ کے تحفظ کی بھی کوئی ضمانت باقی نہیں رہی ہے۔

مصر کے نئے مفتیانِ کرام یہ غیر شرعی قوانین ازھر کے وجود سے کس طرح ہم آہنگ ہو سکتے ہیں۔ ایک طرف یہ قوانین نافذ کئے جارہے ہیں جو اسلامی زندگی کا خاتمہ کر رہے ہیں اور دوسری طرف ازھر سے ہر سال پانچ ہزار کے قریب علماء نکل رہے ہیں جن کو امریکہ اور یورپ اور دوسرے مسلمان و غیر مسلم ممالک میں تبلیغ اسلام کے لئے بھیجا جارہا ہے۔ یہ علماء وہاں جاکر کس اسلام کی تبلیغ کرینگے؟ کیا اُس اسلام کی تبلیغ کرینگے جس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے ہیں یا اُس اسلام کی تبلیغ کرینگے جس کی تشریح وتلقین مصطفیٰ امین، علی امین، احسان عبدالقدوس، احمد بہاؤالدین اور عبدالرحمان شرقاوی[۵۱] کے مقالات و مضامین کر رہے ہیں۔ اور فرید اطرش، شادیہ اور عبدالحلیم حافظ[۵۲] کے نغمے کر رہے ہیں؟

رقص وسرود کی جبری تربیت گرلز اسکولوں میں مسلمان بچیوں کو، جو آئندہ چل کر مائیں بننے والی ہیں، رقص و سرود کی جبراً تعلیم دی جارہی ہے۔ اس تعلیم کی موجودگی میں ان اسکولوں میں مذہب کی جو کچھ برائے نام تعلیم رکھی ہوئی ہے اس کی کیا حیثیت باقی رہ جاتی ہے۔ اور بچیوں کے کردار پر اس کا کیا اثر پڑ سکتا ہے؟ حکومت نے اشتراکیت کو بطور عقیدہ تسلیم کر لیا ہے اور اب مصری قوم پر دباؤ ڈالا جارہا ہے کہ وہ اس عقیدہ پر خود بھی ایمان لائے اور دوسرے عرب ممالک میں بھی اس کو فروغ دے۔ تعلیم کے تمام مدارج میں اشتراکیت کی تدریس

---

۵۱ مصر کے اباحیت پسند ادیب اور ایڈیٹر۔ (م)

۵۲ مصر کے چوٹی کے فلمی ایکٹر اور ایکٹریس۔ آج کل مصر میں مستند افتاء انہی دونوں گروہوں کے ہاتھ میں ہے۔ (م)

کا فیصلہ کر دیا گیا ہے۔ اب ہم یہ دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ کیا ازھر اور دینی مدارس کے نظامِ تعلیم میں بھی اشتراکیت کو شامل کیا جائے گا یا نہیں؟

سوشلزم یا کمیونزم اگر ریاست خود ہی کاشتکار بن جائے، خود ہی صنعتکار ہو، خود ہی تاجر ہو، خود ہی درآمد کنندہ اور برآمد کنندہ ہو، خود ہی اسکول ماسٹر ہو، خود ہی ریڈیو اناؤنسر ہو، خود ہی شاعر ہو، خود ہی ڈانسر ہو اور خود ہی ایکٹر ہو۔ غرض سب کچھ خود ہی ہو۔ اور قوم ساری کی ساری اُس کی قلی اور مزدور ہو اور ہر فرد صرف اتنی اُجرت پر گزر اوقات کرنے پر مجبور ہو جو ایڈمنسٹریٹر یعنی فوج کا ایک جمعدار یا پولیس کا ایک کانسٹیبل مقرر کر دے تو اس نظام میں اور کمیونزم میں کتنا فرق باقی رہ جاتا ہے؟ کیا کمیونزم کا سیدھا سادا مفہوم یہ نہیں ہے کہ سرمایہ اور محنت کو کلیتہً ریاست کے ہاتھ میں دے دیا جائے۔ اور افراد کے اموال اور ملکیتوں پر حکومت کی اجارہ داری قائم کر دی جائے؟ کیا ایسے نظام کے اندر مسجدوں کا وجود محض یہ دھوکا دینے کے لئے نہیں ہے کہ یہاں مذہب کو آزادی حاصل ہے؟ چنانچہ روس اور دیگر کمیونسٹ ممالک میں بھی یہ حربہ اختیار کیا جاتا ہے۔ ان ممالک میں مسجدیں پائی جاتی ہیں۔ مگر ایک تو دوسروں کو غلط فہمی میں ڈالنے کے لئے، اور دوسرے ایک تاریخی یادگار کی حیثیت سے۔ مزید برآں یہ کہ روس سے ہر سال پندرہ بیس اشخاص حج کے لئے بلادِ مقدسہ کا سفر کرتے ہیں۔ مگر ہمیں معلوم ہے کہ ان میں اگر تمام نہ سہی تو اکثر جاسوسی کے فرائض انجام دینے کے لئے ہوتے ہیں۔

جاسوسی کا وسیع نظام اگر ریاست از سر تا پا پولیس کے نظام میں تبدیل ہو جائے اور جاسوسی اور مخبری کا جال اس قدر وسیع پیمانے پر پھیلا دیا جائے کہ ایک شخص ہر وقت جاسوسی کے خوف میں مبتلا رہے ہو۔ اُسے نہ بھائی پر اعتماد ہو، نہ باپ پر اور نہ کسی دوست پر بھروسہ ہو۔ اُسے ٹیکسی ڈرائیور، گھریلو ملازم، ہوٹل کے خادم حتیٰ کہ جوتوں کی پالش کرنے والے سے بھی جاسوسی کا خطرہ لاحق رہتا ہو تو ایسے نظامِ حکومت کو جمہوری کیسے کہا جا سکتا ہے؟ لیکن مصر میں عملاً یہی صورتِ حال پائی جاتی ہے۔

اس وقت مصر کا کوئی باشندہ کسی دوسرے ملک میں تجارت یا ملازمت یا اعزہ و احباب کی ملاقات یا محض سیر و تفریح کی غرض سے مصر سے باہر نہیں جا سکتا۔ اس بارے میں حکومت نے غیر معمولی پابندیاں

عائد کر رکھی ہیں۔ ان پابندیوں کے ساتھ شہری آزادی اور عوامی اقتدار اور انسانی حرمت اور عدل ومساوات کے بڑے بڑے دعاوی کیا حقیقت رکھتے ہیں۔ اور ایسی لاطائل باتوں کو کون احمق تسلیم کرنے کے لئے تیار ہوگا؟

زرعی اصلاحات کا ڈھونگ مصری حکومت نے "زرعی اصلاحات" کے نام سے تمام زمینداروں کی زمینیں چھین کر اپنی تحویل میں لے لی ہیں۔ ان اصلاحات کے تحت پہلے ہر زمیندار کو دو سو ایکڑ تک زمین اپنے قبضہ میں رکھنے کی اجازت دی تھی۔ لیکن چند ماہ ہوئے یہ اجازت صرف ایک سو ایکڑ تک محدود کر دی گئی ہے۔ سلب شدہ زمینوں کا معاوضہ دینے کے لئے حکومت نے مالکانِ اراضی کو تمسکات (BONDS) دئے تھے جن کو "سرکاری کرنسی" کہا جاتا تھا۔ لیکن عملی طور پر حکومت نے مالکانِ اراضی کو ۱۹۵۲ء سے اب تک ان تمسکات پر ایک قرش تک نہیں دیا۔ بعض زمینداروں نے یہ تمسکات محکمۂ مالگزاری کو پیش کیے تھے تاکہ ان کی بقیہ اراضی پر واجب الادا لگان ان سے وضع کر لی جائے۔ مگر محکمے نے انہیں رد کر دیا۔ اور ایک تحصیلدار صاحب نے ایک تمسک گیر سے کہا: "جائیے، ان سرکاری تمسکات کو بطور یادگار گھر میں محفوظ رکھیے۔" اگر ان تمسکات کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ اور سرکاری ادارے بھی انہیں قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں تو کیا اس سے یہ نتیجہ اخذ نہیں ہوتا کہ حکومت نے یہ ساری کارروائی زرعی اصلاحات کے بہانے سے دراصل لوگوں سے کلیتہً زمینیں سلب کرنے کے لیے کی ہے؟

الغرض اس طرح سینکڑوں سوالات سامنے آتے ہیں جن کا کوئی جواب حکومت کے پاس نہیں ہے۔ حکومت کی سوشل اصلاحات کا بھانڈا پھوٹ چکا ہے۔ اور ان اصلاحات کے پسِ پردہ جو عزائم کام کر رہے ہیں وہ بھی صاف کھل کر سامنے آگئے ہیں۔ ہم اس کے سوا کیا کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مصر پر رحم کرے اور اس مصری کو عقل کے ناخن دے جو تختِ فرعون پر براجمان ہے اور اپنے پیش رو کی طرح یہ کہہ رہا ہے کہ "الیس لی ملک مصر وھذہ الانھار تجری من تحتی"۔ اگر اللہ تعالیٰ نے اسے راہِ راست نہ دکھائی تو یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ وہ اس کے ساتھ کیا برتاؤ کرنے والا ہے۔ وہ قادر اور عادل اور جبّار ہے۔ اس کا ارشاد ہے: "وسکنتم فی مساکن الذین ظلموا انفسھم، وتبیّن لکم کیف فعلنا بھم وضربنا لکم الامثال" (ابراہیم)

نبوّت کی ضرورت

(۴)

عبدالحمید صدیقی

ترجمان القرآن کی گذشتہ اشاعت میں ہم نے انسانی فطرت کے بعض بنیادی سوالات کا تذکرہ کیا تھا اور یہ بتایا تھا کہ ان کے جوابات پر ہی انسان اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ڈھانچہ تیار کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں پہلا سوال انسان کے ذہن میں یہ اُبھرتا ہے کہ اس عالم رنگ و بُو کا آغاز کیا ہے۔ آئیے اب سائنس کی بارگاہ سے اس کا جواب معلوم کرنے کی کوشش کریں۔ سائنس دانوں نے اس سوال کے جتنے جوابات دیئے ہیں انہیں اجمالی طور پر دو حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(ا) یہ کائنات خود بخود محض بخت و اتفاق سے معرض وجود میں آگئی۔

(ب) اس کا کوئی آغاز اور انجام نہیں۔ مادہ جس سے اس کی تخلیق کی گئی ہے وہ قدیم ہے۔

اگر پہلے جواب کو اُس کے سارے مضمرات کے ساتھ مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ جواب بذاتِ خود تخلیق کائنات کے معاملے میں سائنس دانوں کی عجز و بیچارگی کا اعتراف ہے۔ سائنس کا عظیم الشان قصر قانون علّت کی بنیاد پر تعمیر کیا گیا ہے یعنی ہر نتیجہ اپنے پیچھے ایک سبب ضرور رکھتا ہے۔ قدرت کے رنگا رنگ مظاہر کو علت و معلول کی لاتعداد کڑیوں میں جوڑ کر ان کے درمیان ایک معنوی ربط معلوم کرنا سائنس کا وہ کارنامہ ہے جس پر سائنس دانوں نے ہمیشہ فخر کیا ہے۔ اب اگر ایک مقام پر پہنچ کر سائنس دان یہ کہنا شروع کر دیں کہ اس کائنات کو محض ایک اتفاقی حادثہ نے جنم دیا ہے، تو علّت و معلول کا سارا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے اور اس طرح اس کی ساری معنویت زائل ہو جاتی ہے۔

اس جواب میں پھر ایک اور تضاد بھی صاف دکھائی دیتا ہے جو قانون علّت کے لگے بندھے نظام سے کسی طرح مناسبت نہیں رکھتا۔ قانون علّت مظاہر کائنات میں جبریت کی حکمرانی پر دلالت کرتا ہے۔ اس کا

مطلب یہ ہے کہ اسباب اور نتائج کی مختلف کڑیوں کے درمیان جو حلقے موجود ہیں وہ بالکل بے حس اور بے شعور ہیں انہیں کسی معاملے میں کوئی ارادہ اور اختیار حاصل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سائنس نے جس نظامِ فکر کی بنیاد رکھی ہے اُس میں جبریت کا پہلو سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ اب اگر انسانوں کا کوئی گروہ اس امر کا دعویٰ کرتا ہے کہ اس کائنات کو محض اتفاق نے جنم دیا ہے اور اس نتیجہ کے پیچھے کوئی علت کارفرما نہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اتفاق "جبر" کی عملداری سے آزاد ہے۔ یہاں پھر ایک ایسا تضاد سامنے آتا ہے جسے آج تک دور نہیں کیا جاسکا۔ اگر یہ "حادثہ" یا "اتفاق" اندھا بہرا لزوم نہیں بلکہ آزادی کی دولت اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے تو پھر اس کے عمل کا محرک کیا ہے۔ کیا اس کے اندر کوئی ایسا شعور تھا جس نے اس سے تخلیق کائنات کا عظیم الشان کام سرانجام دینے کی ترغیب دی۔

آزادی اور شعور دو لازم ملزوم چیزیں ہیں۔ اگر آپ یہ کہتے ہیں کہ اتفاق نے از خود کائنات کی تخلیق کردی اور وہ کسی علت کا پابند نہ تھا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ اپنے عمل کے لئے کوئی ایسا محرک ضرور رکھتا ہے جس نے اُس کے اندر ایک خاص کام کرنے کی تڑپ اور ولولہ پیدا کیا۔ اس سے تو یہ معلوم ہوا کہ اُس "اتفاق" نے اپنے اندر آگہی اور شعور کی ساری قوتیں سمیٹ رکھی ہیں۔ اگر "اتفاق" کو شعور و احساس کا امین تصوّر کرلیا جائے تو پھر وہ اندھا بہرا لزوم نہیں رہتا اور اس طرح اُس کی "اتفاقیت" جو درحقیقت جدید سائنس دانوں کے نزدیک اُس کی برتری کا سب سے بڑا سبب ہے، خود بخود ختم ہو جاتی ہے۔

سائنس دان "حادثہ" یا "اتفاق" کو جن معنوں میں بالعموم استعمال کرتے ہیں اُن سے اُن کی مراد یہ ہوتی ہے کہ یہ واقعہ جن اسباب کی بنا پر معرضِ وجود میں آیا ہے وہ اگرچہ کسی علت کا نتیجہ ہے لیکن اُس علت کو ابھی تک وہ پوری طرح سمجھ نہیں پائے یا دوسرے لفظوں میں علت کے اس حلقے سے پہلے جو حلقہ موجود ہے وہ ابھی اُن کی نظروں سے اوجھل ہے۔ اتفاقات کے ان مختلف حلقوں میں خواہ اور کئی خوبیاں ہوں لیکن انہیں آزادی اور شعور کی خوبیوں سے لازمی طور پر عاری سمجھا جاتا ہے۔ حادثات کے اندر ان دو خوبیوں کو اگر تسلیم کرلیا جائے تو پھر وہ حادثات نہیں رہتے بلکہ باشعور محرکات بن جاتے ہیں اور اس طرح اندھے بہرے لزوم کی گرفت سے آزاد ہو کر ایک باشعور اور قادرِ مطلق ذات سے

وابستگی پیدا کرتے ہیں، کیونکہ اُسی ذات سے انہیں شعور اور آزادی کی متاعِ گرانمایہ حاصل ہوتی ہے۔
آپ اس معاملے پر جتنا زیادہ غور کریں گے آپ کو کائنات کی اس اتفاقی تخلیق کے معاملے میں اُلجھنوں پر اُلجھنیں پیش آتی چلی جائیں گی۔ اگر یہ کائنات کسی ایسے اتفاق کی کرشمہ سازی ہے جو سائنس دانوں کا "اتفاق" ہے یعنی جس کے پیچھے بہرحال کوئی علّت کارفرما ہے مگر ابھی تک اُس کا سراغ نہیں لگایا جاسکا تو پھر معاملہ اتفاق پر نہیں بلکہ کسی نامعلوم علّت پر آکر رُک جاتا ہے۔ اس لئے یہ کہنا کہ تخلیق کائنات بخت و اتفاق کا نتیجہ ہے کائنات پر ایک تصریح بہتان ہے۔ اور اگر یہ فی الواقع کسی ایسے اتفاق کی ہی رہینِ منت ہے جس کے پیچھے کوئی علّت نہیں تو پھر یہ اتفاق علت و معلول کی جکڑ بندیوں سے آزاد ہونے کی وجہ سے اپنا ارادہ اور اختیار رکھتا ہے۔ اس لئے یہ اتفاقیت کی خوبی سے یکسر محروم ہے۔ لہٰذا کائنات کی تخلیق کو کسی اتفاقی حادثہ سے تعبیر کرنا حقیقت نہیں بلکہ حقیقت کا مُنہ چڑانا ہے۔

آئیے اب سائنس دانوں کے اس دعوے پر غور کریں کہ اس کائنات کو مادہ نے جنم دیا جو قدیم ہے۔
آپ کائنات کے مختلف مظاہر کا جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان کے مابین ایک نظم و ترتیب پائی جاتی ہے۔ اسی نظم و ترتیب نے اُنہیں ایک ضابطے کا پابند بنا دیا ہے جسے قانونِ قدرت کہا جاتا ہے۔ اس قانون کا منشاء یہ ہے کہ فطرت کے رنگارنگ مظاہر کے درمیان ایک ہم آہنگی اور معنوی ربط تلاش کیا جائے۔ چھوٹے سے چھوٹے کیڑے اور درخت سے گذر کر جب انسان اپنے وظائف بدنی پر غور کرتا ہے تو وہ یہ دیکھتا ہے کہ اعلیٰ درجہ کی مشین ہے جو کمال باقاعدگی اور ترتیب کے ساتھ اپنا کام کر رہی ہے۔ پھر اس مشین کا فطرت کے وسیع اور پیچیدہ نظام کے ساتھ ایک نہایت ہی گہرا تعلق ہے۔ پہاڑوں اور جنگلوں کی خاموش گویائی میں، سورج کی خشمگیں کرنوں میں، چاند کی ٹھنڈک میں، صبح کی صباحت اور شام کی ملاحت میں اگرچہ بظاہر کوئی چیز مشترک نظر نہیں آتی، لیکن اگر ان ظاہری پردوں کے پیچھے جھانک کر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ قُدرت کے یہ رنگارنگ مظاہر ایک ہی رُخِ زیبا کے مختلف عکس ہیں:

کثرت میں ہوگیا ہے وحدت کا راز مخفی
بلبل میں جو چہک ہے وہ پھول میں مہک ہے،

یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس کی تائید مادہ کے اندھے بہرے لزوم سے نہیں ہو سکتی۔ جب ایک شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ یہ سارا کارخانہ قدرت صرف مادہ کی کرشمہ سازی ہے تو پھر دوسرا سوال انسان کے سامنے یہ آتا ہے کہ کیا مادہ کوئی باشعور ہستی ہے۔ کیونکہ بے شعور اور بے جان مادہ سے کسی ایسی کائنات کی تخلیق ممکن نہیں جس کے مختلف شعبے ایک وحدت کی نشاندہی کرتے ہوں ؂ لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں "کی کیفیت صرف اسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے جب ایک باشعور ذات ایک لگے بندھے منصوبے کے تحت پورے غور و فکر کے بعد ان دونوں کی نہ صرف صورت گری کرے بلکہ ان دونوں کے درمیان معنوی ربط بھی پیدا کرے۔ کسی باشعور ذات کے وجود کا تقاضا انسانی فکر و احساس کا بالکل فطری تقاضا ہے۔ کیونکہ مادے کے اندھے بہرے لزوم سے کسی مادی چیز کا وجود تو ممکن ہے۔ لیکن اس میں حُسنِ ترتیب اور حُسنِ تنظیم کا کبھی تصوّر نہیں کیا جا سکتا۔ اسی موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے رابرٹ فلنٹ اپنی کتاب (THEISM) میں لکھتا ہے:

> سائنس دان اس چیز کے دعویدار ہیں کہ مادہ کے چھوٹے چھوٹے ریزے ازلی اور ابدی ہیں۔ چلئے ہم اس خیال کو بھی چند لمحوں کے لیے حقیقت تسلیم کر لیتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ مادہ کے ان لاتعداد ذرّات نے ایک ایسی کائنات کو کس طرح جنم دیا جس کے مختلف مظاہر میں حیرت انگیز ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ آخر اس کائنات نے موجودہ شکل و صورت کس طرح اختیار کی؟ پھر کائنات کے مختلف اور بظاہر ان میل گوشوں کے مابین جن میں ہر ایک اپنے وجود کے لئے بے شمار الگ الگ اسباب کا محتاج ہے، کس طرح ایک معنوی ربط پیدا ہو گیا۔ کیا ایٹم کے ان چھوٹے چھوٹے ذرّات نے کائنات کی ترتیب سے پہلے اس کی منصوبہ بندی کے لئے ایک دوسرے سے مشاورت کی تھی۔ یہ سارے تصوّرات ایک غلط اندازِ فکر کے ترجمان ہیں۔" (صفحہ ۱۰۷)

صرف مادہ کو ازلی اور ابدی مان لینے سے مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ اس سے زیادہ سے زیادہ جو چیز ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ کائنات جس جوہر سے عبارت ہے وہ اوّل روز سے ہی موجود تھا اور وہ کبھی فنا نہیں ہو سکتا۔ لیکن

اس دور از کار مفروضے کو تسلیم کر لینے کے بعد یہ سوال اپنی جگہ پر بہر حال موجود رہتا ہے کہ مادہ کے اندھے بہرے لزوم سے ایک ایسی کائنات کس طرح معرضِ وجود میں آ گئی جس کا ہر جزو حکمت و دانائی کا ایک زبردست شاہکار معلوم ہوتا ہے۔ اگر بالفرض یہ بھی مان لیا جائے کہ مادہ کے یہ چھوٹے چھوٹے ذرّات اپنے اندر شعور، آگہی اور وقوف کی ساری صلاحیتیں رکھتے ہیں تو اس کے بعد بھی پہلا اعتراض اپنی جگہ اُسی طرح قائم رہتا ہے۔ کیا ان سارے ذرّات نے آپس میں پوری طرح مشاورت کر کے کائنات کی تخلیق شروع کی اور وہ جب تک اس فرض کو سرانجام دیتے رہے ان کے اندر کبھی بھی اختلاف رونما نہ ہوا۔ آخر وہ کونسی ایسی قوت تھی جس نے انہیں اس اہم اور نازک مرحلہ پر باہم متحد رکھا۔ ظاہر بات ہے کہ یہ قوت مادہ کی کوئی داخلی قوت تو نہیں ہو سکتی۔ اگر یہ کہا جائے کہ مادہ کے ریزوں میں یہ صلاحیت پہلے سے موجود تھی کہ وہ اپنے اپنے کام میں منہمک رہیں اور ایک دوسرے سے دست و گریباں ہونے کی بجائے معاونت اور دستگیری کریں تو پھر ذہن یہ چیز سوچنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے کہ آخر وہ کونسی ذات ہے جس نے مادہ کے ان چھوٹے چھوٹے ذرّات میں ایسی مختلف قوتیں ودیعت کر رکھی تھیں جن کے تعامل سے کائنات کا یہ وسیع اور پیچیدہ نظام قائم ہوا۔ اگر ننھے منھے ذرّات ہی اس کائنات کے خالق ہیں تو ان ذرّات ہی میں سے بہرحال ایک ذرّہ ضرور ایسا ہونا چاہیے جس میں شعور اور آگہی کی قوّت ان سب ذرّات کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہو اور پھر اس کے اندر اتنی طاقت بھی موجود ہو کہ وہ سب ذرّات پر بلاشرکتِ غیرے حکومت کر سکے اور ان کی مختلف صلاحیتوں کو کام میں لا کر کائنات کو ترتیب دے۔ قوت و طاقت کا یہ تناسب بالکل فطری سی چیز ہے۔ لیکن اس مقام پر پہنچ کر فکری دلیل پھر حیران ہو جاتی ہے اور سوچنے لگتی ہے کہ آخر وہ کونسی ایسی ذات ہے جس نے اَن گنت ذرات کے درمیان قوّت و طاقت کا یہ تناسب قائم کیا تاکہ ان سے پوری طرح فائدہ اُٹھایا جا سکے۔ اس تناسب کو تخلیق کائنات میں جو غیر معمولی اہمیّت حاصل ہے اُس سے انکار نہیں کیا جا سکتا، لیکن اس کی اہمیّت کا سارا دارومدار اُس نقشہ پر ہے جو اس کائنات کو معرضِ وجود میں لانے سے پہلے تیار کیا گیا تھا۔ اگر نقشہ میں کائنات کی ترتیب اس سے مختلف ہوتی تو یہ سارے ذرات اپنی قوت کے باوجود یکسر بیکار ہوتے۔ ان کی جو کچھ اہمیّت بھی ہے وہ اسی نقشہ کی رہینِ منّت ہے۔ انسانی عقل کے

اندر یہ بات تو کسی طرح آسکتی ہے کہ اس مادی کائنات کو مادہ کے چھوٹے چھوٹے ریزوں نے جنم دیا۔ لیکن عقل یہ چیز کبھی باور کرنے پر آمادہ نہیں ہوتی کہ مادہ کے چھوٹے چھوٹے ذرّات کسی ایسے نظام کا منصوبہ تیار کرلیں جس کا پہلے کوئی نام و نشان تک نہ تھا[۱]۔ لہٰذا مادہ کو تخلیق کائنات کی علّت کہنا ایک ایسی جسارت ہے جس کی مشاہدہ اور عقل تصدیق نہیں کر سکتے۔

علم کیمیا اور ریاضی کے ایک مشہور عالم نے اسی موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

کیا انسانی عقل اس بات کو کبھی تسلیم کر سکتی ہے کہ بے شعور مادہ محض بخت و اتفاق سے خود بخود معرضِ وجود میں آگیا، پھر اُس نے بالکل اتفاقی طور پر بغیر کسی خارجی محرک کے، ایک ضابطے کی پابندی شروع کردی اور آج تک یہ "اتفاق" ہی اس ضابطہ کو اس پر مسلّط کیے ہوئے ہے۔

علم کیمیا کے مطالعہ سے یہ حقیقت بے نقاب ہو چکی ہے کہ مادہ آہستہ آہستہ معدوم ہو رہا ہے۔ فنا کی یہ رفتار گو مادہ کی ہر قسم میں ایک جیسی نہیں کئی قسمیں بڑی سُرعت کے ساتھ مٹ رہی ہیں اور بعض آہستہ آہستہ بربادی کی طرف جا رہی ہیں، لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ مادہ کی کوئی قِسم بھی ایسی نہیں جو فنا کی دستبرد سے مکمل طور پر محفوظ ہو۔ اس بناء پر یہ کہنا کہ مادہ کوئی ازلی اور ابدی چیز ہے بالکل غلط ہے۔ مادہ کا بہر حال ایک آغاز ہے۔ علم کیمیا اور دوسرے سائنسی علوم کے انکشافات سے اس امر کا واضح نشان ملتا ہے کہ مادہ کا یہ آغاز آہستہ اور بتدریج نہ تھا بلکہ اس کے برعکس یہ اچانک معرضِ وجود میں لایا گیا۔ اس ضمن میں بعض ایسے شواہد بھی موجود ہیں جن سے اس کی پیدائش کے وقت کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ مادی دنیا ایک خاص وقت میں تخلیق کی گئی،

---

[۱] ممکن ہے یہاں کوئی صاحب یہ کہہ دیں کہ دیکھئے انسان کا جسم مادے سے عبارت ہے لیکن اُس کا دماغ نئے نئے نقشے بنانے کی قُدرت رکھتا ہے۔ یہ ایک بہت بڑی غلط فہمی ہے۔ ہمارا ذہن جب بھی منصوبہ بندی کرتا ہے تو وہ مادی دُنیا کے ہی تجربات اور مشاہدات کو ایک نئے سرے سے ترتیب دے لیتا ہے۔ کائنات کی تخلیق کا معاملہ اس سے بہر حال مختلف ہے اُس کا جس وقت نقشہ بنایا گیا تھا تو اس طرح کی کوئی چیز پہلے سے موجود نہ تھی۔

اور اُسی لمحہ سے وہ بخت و اتفاق کی نہیں بلکہ ایک ضابطہ کی پابندی کرتی چلی آ رہی ہے۔
مادی دُنیا اور اُس کے قوانین و ضابطے چونکہ خود اپنے خالق نہیں ہو سکتے اور نہ ہی انہیں تخلیق پر قُدرت حاصل ہے اس لئے انسان یہ نتیجہ اخذ کرنے میں سو فی صدحق بجانب ہے کہ تخلیق کا یہ عظیم الشّان کام کسی غیر مادی قوت نے سرانجام دیا ہے۔ پھر یہ تخلیق چونکہ اپنے اندر بے شمار پیچیدگیاں اور رنگینیاں بھی رکھتی ہیں اس لئے انسانی عقل اپنے آپ کو اس حقیقت کے ماننے پر مجبور پاتی ہے کہ وہ اُس خالق کے بارے میں، یہ تصوّر بھی قائم کرے، کہ وہ کوئی اندھا بہرا لزوم نہیں بلکہ سوچنے، سمجھنے والی اور تدبیر کرنے والی ذات ہے جس نے اپنی حکمت بالغہ کے تحت پہلے اس کائنات کی منصوبہ بندی کی اور اپنے ارادہ اور مشیت کے تحت اُس منصوبہ کو عملی جامہ پہنایا۔[1]

تخلیق کائنات، اُس کے آغاز اور انجام کے متعلق اس ایک نظریہ کے علاوہ اور جتنے نظریات بھی پیش کئے گئے ہیں اُن میں قدم قدم پر فکر و نظر کا تضاد ملتا ہے۔ سائنس دان محض تجربہ اور مشاہدہ کی مدد سے، اور مادہ کو اس کی علّت قرار دے کر تخلیق کائنات کی کوئی ایسی توجیہ نہیں کر سکے جس پر انسان کا قلب و دماغ پوری طرح مطمئن ہو۔ سائنس مذہب کی رہنمائی حاصل کئے بغیر اس میدان میں بالکل عاجز ہے اور اُسے اپنی بیچارگی اور درماندگی کا اعتراف ہے۔

سائنس دانوں نے اس سلسلہ میں جو کچھ کہا ہے اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ مشاہدہ کی مدد سے کائنات کے آغاز و انجام کے بارے میں کوئی قطعی بات نہیں کہہ سکتے چنانچہ پروفیسر لیتمر جو فرانس کا مشہور سائنس دان ہے اُس نے اس حقیقت کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

"کائنات کے آغاز و انجام تک مشاہدے کی رسائی نہیں ہے۔ اس لیے ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ کسی ازلی یا ابدی وجود کا انکار کریں۔ جس طرح ہمارا کام یہ بھی نہیں ہے کہ ہم اس کو ثابت کریں۔ ہمارا کام نفی و اثبات دونوں سے الگ ہے۔

یہ ہے تذبذب کا وہ مقام جس پر سائنس تخلیق کائنات کے مسئلہ میں انسان کو لا کر کھڑا کر دیتی ہے۔

[1] Evidence of God in Expanding universe p.44

رسائل و مسائل

قادیانیوں کی غلط تاویلات

سوال۔ قادیانی مبلغ اپنا انتہائی زور اجرائے نبوت کے ثبوت پر صرف کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں وہ مندرجہ ذیل دو آیتیں خصوصی طور پر پیش کرتے ہیں اور انہی پر اپنے دعویٰ کی بنیاد رکھتے ہیں:

۱۔ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا۔ (النساء۔ ۶۹)

"اور جو اللہ اور رسول کی اطاعت کرے گا وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوگا جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہدا اور صالحین، کیسے اچھے ہیں یہ رفیق جو کسی کو میسر آئیں۔"

اس سے وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ان آیات میں بالترتیب چار چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ انبیاء اور صدیقین اور شہدا اور صالحین۔ انکی دانست میں ان میں سے تین درجے یعنی صدیقین، شہدا اور صالحین تو اُمت محمدیہ کو مل چکے ہیں، لیکن چوتھا درجہ نبی ہونا باقی تھا۔ اور وہ مرزا غلام احمد قادیانی کو ملا ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ اگر معیت کا مطلب یہ ہے کہ اُمت محمدیہ کے لوگ قیامت کے دن صرف مذکورہ گروہ کی رفاقت میں ہونگے تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ اُمت محمدیہ میں کوئی صالح، شہید اور صدیق ہے ہی نہیں۔ اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر جب آیت میں چار مراتب (گروہوں) کا ذکر کیا گیا ہے تو پھر گروہ انبیا کے اُمت میں موجود ہونے کو کس دلیل کی بنا پر مستثنیٰ کیا جاتا ہے۔

۲۔ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔ (اعراف۔ ۳۵)

"اے بنی آدم، اگر تمہارے پاس میرے رسول آئیں جو تم پر میری آیات پڑھیں پس جو ڈرا اور اصلاح کر لی ان پر کوئی خوف نہیں اور نہ وہ غمگیں ہوں گے۔"

اس آیت سے وہ یہ استدلال کرتے ہیں کہ اس آیت میں خطاب تمام نوع انسانی سے ہے۔ اور نزول کے لحاظ سے یہ آیت نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) پر نازل ہوئی ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ اگر اجرائے نبوت مقصود نہ ہوتا تو پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ آیت کیوں نازل ہوتی۔ نیز یہ کہ اس میں مضارع کا صیغہ (یاتینکم) مع نون ثقیلہ استعمال کیا گیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ "بالضرور تمہارے پاس میرے نبی آئیں گے"۔ اس سے ثابت ہوا کہ نبی اکرم کی فرماں برداری میں نبی آ سکتا ہے۔

آپ سے استدعا ہے کہ اس مسئلہ پر اپنے رسالے میں مدلل بحث فرمائیں، تاکہ یہ افادہ عام کا موجب ہو۔

جواب۔ جب کسی مسئلے کا فیصلہ اللہ اور اس کے رسول نے بالکل صاف اور صریح نصوص میں کر دیا ہو تو پھر اسی مسئلے میں ان نصوص کو چھوڑ کر دوسری آیات و احادیث سے جو دراصل اس خاص مسئلے کا فیصلہ کرنے کے لیے وارد نہیں ہوئی ہیں، اپنے مطلب کے معنی نکالنا اور نصوصِ قطعیہ کے بالکل خلاف عقیدہ یا عمل اختیار کر لینا درحقیقت انتہائی گمراہی، بلکہ خدا اور رسول کے خلاف بدترین بغاوت ہے۔ جو شخص علانیہ اللہ اور اس کے فرمان کے خلاف کوئی مسلک اختیار کرتا ہے وہ تو کم تر درجے کی بغاوت کرتا ہے۔ مگر یہ بہت زیادہ بڑے درجے کی بغاوت ہے کہ آدمی اللہ اور رسول کے فیصلے کے خلاف خود اللہ اور رسول ہی کے ارشادات کو توڑ مروڑ کر استعمال کرنے لگے۔ یہ کام جو لوگ کرتے ہیں ان کے متعلق ہم کسی طرح بھی یہ فرض نہیں کر سکتے کہ وہ سچے دل سے اللہ اور اس کے رسول کو مانتے ہیں۔

یہ سوال کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں یا نہیں اور آپ کے بعد کوئی نبی آ سکتا ہے یا نہیں، اس کا فیصلہ کرنے کے لیے ہم آیت وَمَن يُطِعِ اللهَ وَالرَّسُوْلَ اور آیت يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اور ایسی ہی دوسری آیتوں کی طرف صرف اسی صورت میں رجوع کر سکتے تھے جبکہ اللہ اور اس کے رسول نے خاص طور پر اسی سوال کا جواب کسی خاص نص میں نہ دے دیا ہوتا۔ مگر جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیت خاتم النبیین میں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بکثرت احادیثِ صحیحہ میں ہم کو خاص طور پر اسی سوال کا واضح جواب مل چکا ہے تو آیت وَمَن يُطِعِ اللهَ اور يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اور ایسی ہی دوسری آیات کی طرف رجوع کرنا، اور پھر ان سے نصوص قطعیہ صریحہ کے خلاف مطالب نکالنا صرف اسی شخص کا کام ہو سکتا ہے جو خدا سے بالکل بے خوف ہو چکا ہو اور جسے یہ بھی یقین نہ

ہو کہ کبھی مر کر خدا کے سامنے جواب دہی بھی کرنی ہوگی۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے تعزیرات پاکستان کی ایک خاص دفعہ میں ایک فعل کو بالفاظ صریح جرم قرار دیا گیا ہو، اور کوئی شخص اس دفعہ کو چھوڑ کر قانون کی دوسری غیر متعلق دفعات کا جائزہ اس غرض کے لیے لیتا پھرے کہ کہیں سے کوئی اشارہ اور کہیں سے کوئی نکتہ نکال کر، اور پھر انہیں جوڑ جاڑ کر اسی فعل کو جائز ثابت کر دے جسے قانون کی ایک صریح دفعہ جرم قرار دے رہی ہے۔ اس طرح کا استدلال اگر دنیا کی پولیس اور عدالت کے سامنے نہیں چل سکتا، تو آخر یہ خدا کے ہاں کیسے چل جائیگا۔

پھر جن آیات سے یہ لوگ استدلال کرتے ہیں بجائے خود ان کو پڑھ کر دیکھا جائے تو آدمی حیران رہ جاتا ہے کہ ان میں سے وہ مضمون آخر کہاں نکلتا ہے جو یہ لوگ زبردستی ان سے نچوڑنا چاہتے ہیں۔

پہلی آیت جو آپ نے نقل کی ہے اس میں جو بات فرمائی گئی ہے وہ صرف یہ ہے کہ اللہ اور رسول کی اطاعت کرنے والے انبیا و صدیقین اور شہدا و صالحین کے ساتھ ہوں گے۔ اس سے یہ مضمون کیسے نکل آیا کہ جو لوگ اللہ اور رسول کی اطاعت کریں گے وہ یا تو نبی ہو جائیں گے یا صدیق یا شہید یا صالح۔ پھر ذرا سورۂ حدید کی آیت ۱۹۔ ملاحظہ فرمائیے۔ اس میں ارشاد ہوا ہے کہ وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الصِّدِّيقُونَ وَالشُّهَدَاءُ عِندَ رَبِّهِمْ "اور جو لوگ ایمان لائے اللہ اور اس کے رسولوں پر وہی صدیقین اور شہداء ہیں اپنے رب کے نزدیک۔" اس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ ایمان کے نتیجے میں جو دولت کسی کو مل سکتی ہے وہ صرف صدیق اور شہید ہو جانے کی ہے۔ رہے انبیاء تو ان کی معیت نصیب ہو جانا ہی اہل ایمان کے لیے کافی ہے کسی عمل کے انعام میں کسی شخص کا نبی ہو جانا ممکن نہیں ہے۔ اسی بنا پر سورۂ نساء کی آیت میں فرمایا کہ اللہ اور رسول کی اطاعت کرنے والے انبیاء اور صدیقین و شہداء کے ساتھ ہونگے۔ اور سورۂ حدید کی آیت میں فرمایا کہ اللہ اور رسول پر ایمان لانے والے خود صدیق اور شہداء بن جائیں گے۔

دوسری آیت ایک سلسلہ بیان سے تعلق رکھتی ہے جو سورۂ اعراف میں آیت ۱۱ سے ۳۶ تک مسلسل چل رہا ہے۔ اس سیاق و سباق میں رکھ کر اسے دیکھا جائے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ بنی آدم سے یہ خطاب آغاز تخلیق انسانی میں کیا گیا تھا۔ اور یہ مضمون قرآن مجید میں صرف اسی مقام پر بیان نہیں ہوا ہے بلکہ سورۂ بقرہ آیت ۳۸، ۳۹ میں بھی قریب قریب اسی طرز پر آیا ہے۔ اس کو پڑھ کر یہ مطلب کیسے نکالا جا سکتا ہے کہ ان

آیات میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد انبیاء کے آنے کا ذکر ہے۔ اس میں تو اس وقت کا قصہ بیان کیا جارہا ہے جب حضرت آدم اور ان کی بیوی کو جنّت سے نکال کر زمین پر لایا گیا تھا۔

مسیح کے ابن اللہ ہونے کا بے اصل عقیدہ

سوال۔ میں ایک عیسائی کی حیثیت میں آپ سے ہم کلام ہو رہا ہوں۔ ایک مسیحی ادارے کی جانب سے مجھے ایک مقالہ تیار کرنے کی ہدایت کی گئی ہے جس میں حضرت مسیح کے ابن اللہ ہونے کے متعلق اسلامی نقطہ نظر واضح کیا گیا ہو۔ آپ مجھ سے زیادہ اس امر سے آگاہ ہیں کہ جب حضرت مسیح یا کسی اور کے لیے یہ لقب استعمال کیا جاتا ہے تو مسلمان بالعموم اسے ناپسند کرتے ہیں۔ اس مسئلے میں مسلمانوں کا جو موقف ماضی یا حال میں رہا ہے، اسے صحیح طور پر پیش کرنے کے لیے میں آپ کی رائے کو خاص اہمیت دیتا ہوں۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ اس مسئلے کی وضاحت کرتے ہوئے مندرجہ ذیل سوالات پر اپنی توجہ مرکوز رکھیں گے:

۱۔ حضرت عیسیٰ کے لیے "ابن اللہ" کے لقب کا استعمال عام طور پر مسلمانوں کے لیے کیوں ناقابلِ قبول ہے؟ کیا آپ بھی اس معاملے میں عامۂ مسلمین کے ہم نوا ہیں؟

۲۔ اس مسئلے میں آپ کے پاس اپنے نقطۂ نظر کے حق میں قرآن یا حدیث کی رُو سے کیا دلائل ہیں؟

۳۔ کیا "ابن اللہ" کی ترکیب کا استعمال کسی حالت میں صحیح اور قابلِ تسلیم بھی ہو سکتا ہے؟ دوسرے لفظوں میں کوئی استثنا ایسا ممکن ہے کہ ان الفاظ کو مجازی یا غیر مادی معنوں میں حضرت عیسیٰ کے لیے استعمال کیا جا سکے؟ کیا "ابن اللہ" کو کلی نہیں تو جزوی حیثیت ہی سے "کلمۃ اللہ" کے مشابہ قرار دیا جا سکتا ہے؟

۴۔ انجیل (عہدِ جدید) میں حضرت عیسیٰ کے لیے "ابن اللہ" کثرت سے مستعمل ہونے کی توجیہ آپ کے نزدیک کیا ہو سکتی ہے؟ کیا آپ کے نزدیک یہ تحریف یا اضافہ ہے؟ اگر ایسا ہے تو یہ کب اور کیوں ہوا؟

جواب ۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں اسلام کا نقطہ نظر پیش کرنے کی دعوت دی ہے۔ آپ کے سوالات کا مختصر جواب یہ ہے کہ قرآن اس مضمون کی بالکل صاف، قطعی اور غیر مبہم طریقے سے صراحت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کسی معنی میں بھی کوئی بیٹا نہیں ہے۔ نہ اس نے کسی کو جنا ہے، نہ کسی کو اپنا بیٹا بنایا ہے۔ اس کی طرف اولاد کو منسوب کرنا قطعی شرک ہے۔ مسیح علیہ السلام اللہ کے بندے اور رسول تھے نہ کہ اس کے بیٹے۔ ان کی کوئی خصوصیت اس کے سوا نہ تھی کہ اللہ نے اپنے خاص حکم سے ان کو کنواری مریم کے پیٹ سے باپ کے بغیر پیدا کیا۔ اسی وجہ سے ان کو "اللہ کا کلمہ" اور "اللہ کی طرف سے ایک روح" کہا گیا لیکن اس خصوصیت کی بنا پر ان کے اندر الوہیت کا کوئی ادنیٰ شائبہ بھی نہیں پایا جاتا۔ ان کی اس خصوصیت میں حضرت آدم بھی ان کے شریک اور مشابہ ہیں کیونکہ انہیں بھی بغیر باپ کے براہِ راست مٹی سے پیدا کیا گیا تھا۔ اگر معجزانہ پیدائش کی بنا پر حضرت آدم خدا یا خدا کے بیٹے نہیں ہو گئے تو حضرت عیسیٰؑ کیسے ہو گئے۔

اس کے لیے براہِ کرم قرآن مجید کی حسب ذیل آیات ملاحظہ فرمائیے:

البقرہ : ۱۱۶-۱۱۷	مریم : ۸۸ تا ۹۳	آل عمران : ۴۵ تا ۵۱	المائدہ : ۷۲ تا ۷۵
الانعام : ۱۰۱	الانبیاء : ۲۵ تا ۲۹	آل عمران : ۵۹	المائدہ : ۱۱۶ تا ۱۱۸
یونس : ۶۸	المؤمنون : ۹۱	النساء : ۱۷۱-۱۷۲	التوبہ : ۳۰-۳۱
الکہف : ۴-۵	الاخلاص : ۳	المائدہ : ۱۷	مریم : ۱۶ تا ۷۵

قرآن کی یہ تصریحات ایسی صاف اور واضح ہیں کہ ان کے بعد کسی حدیث یا تفسیر کو نقل کرنے کی کوئی حاجت نہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ اسلام میں جو بات قرآن سے صاف صاف ثابت ہو جائے وہ پھر کسی اور ثبوت کی محتاج نہیں رہتی۔

انجیل میں مسیح علیہ السلام کے ابن اللہ ہونے کا عقیدہ کیسے آیا اس کے متعلق میرے لیے کچھ کہنا مناسب نہیں ہے۔ بہتر یہ ہے کہ آپ خود حسب ذیل تین باتوں کی تحقیق کر کے کوئی رائے قائم کریں:

اوّل، بائبل کے عہدِ جدید میں جو صحیفے درج ہیں کیا ان میں سے کوئی بھی اللہ تعالیٰ کے اصل الفاظ میں

ہے اور انسانی کلام اس کے ساتھ ملا ہوا نہیں ہے؟

دوم، کیا مسیح علیہ السلام نے خود کہیں اپنے لیے "ابن اللہ" کا لفظ استعمال کیا ہے؟ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ وہ ابن اللہ کے بجائے اپنے لیے ابنِ آدم کا لفظ بولتے تھے؟ اور اگر حضرت مسیح کے ابن اللہ ہونے کا مفہوم ان کے خدا کو باپ کہنے سے اخذ کیا جائے تو کیا انہوں نے خدا کو مخصوص طور پر صرف اپنا ہی باپ کہا ہے؟ کیا بائیبل میں ایسی بکثرت مثالیں موجود نہیں ہیں جن میں اللہ کو عام انسانوں کا باپ بھی کہا گیا ہے؟

سوم، کیا جو بات مسیح کی اپنی تعلیم سے ثابت نہ ہو وہ کسی اور کے بیان کرنے سے ایک مسلّم عقیدہ قرار پانی چاہیے؟ خصوصاً جبکہ وہ مسیح کے تعلیم کیے ہوئے عقیدۂ توحید کے خلاف پڑتی ہو اور جس کی بدولت انسان خدا پرستی کے ساتھ ساتھ مسیح پرستی میں بھی مبتلا ہو جاتا ہو؟

ان تین سوالات کو نگاہ میں رکھ کر اگر آپ بائیبل کے عہد جدید کا محققانہ (غیر متعصبانہ) مطالعہ فرمائیں گے تو آپ پر خود واضح ہو جائے گا کہ مسیح علیہ السلام کے متعلق اُن کے پیروؤں میں "ابن اللہ" کا عقیدہ پیدا ہونے کی کوئی وجہ اس کے سوا نہیں ہے کہ ان لوگوں نے اپنے پیشوا کی محبت و عقیدت میں بے جا غلو کیا ہے۔ ورنہ خود بائیبل میں کہیں نہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول منقول ہوا ہے کہ مسیح میرا بیٹا ہے، اور نہ مسیح کا اپنا کوئی قول ایسا موجود ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کا بیٹا ہوں۔ سوال یہ ہے کہ جب نہ خدا نے ایسا کہا، اور نہ مسیح نے ایسی کوئی خبر دی تو آخر دوسرے لوگوں کو یہ اطلاع کہاں سے ملی کہ مسیح علیہ السلام معاذ اللہ خدا کے بیٹے تھے؟

آٹھ رکعت اور بیس رکعت کی بحث

سوال۔ آپ کا ایک جواب دربارہ تراویح ہفت روزہ "ایشیا" لاہور مورخہ ۳۲/۴۲ ۷ میں شائع ہوا۔ جسے پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے مسئلے کی کوئی عالمانہ تحقیق نہیں کی۔ بلکہ ایک چلتی سی بات سمجھوتہ کرانے والوں کی سی کر دی ہے جس سے مسئلہ بجائے سلجھنے کے اُلجھ گیا ہے۔ ایک طرف آپ فرماتے ہیں کہ آنحضرت کی تراویح آٹھ رکعت ہی تھیں۔ دوسری طرف آپ فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے بیس جاری کیں۔ اور تمام صحابہ نے اس پر اتفاق کیا۔ اور بعد کے خلفاء نے اسی کو دستور بنایا۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب سنت نبوی آٹھ ہی ہے۔ تو پھر حضرت عمرؓ نے بیس کہاں سے لے لیں۔ اور کیونکر ان کو مقرر کر دیا۔ تمام صحابہ اور خلفاء نے سنت نبوی کو نظر انداز کر کے بیس پر کیسے اجماع کر لیا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ صحابہ ایسی جسارت کریں۔ (مولانا۔ یا تو آٹھ سنت نبوی نہیں۔ یا پھر بیس پر اجماع نہیں)

جب سنت نبوی بقول آپ کے آٹھ ہی رکعت ہیں۔ تو بجائے یہ کہنے کے کہ حضرت عمرؓ نے بیس جاری کیں، کیا یہ کہنا زیادہ قرین قیاس نہیں کہ حضرت عمرؓ نے آٹھ ہی جاری کی تھیں۔ کیونکہ اولاً تو مسنون تعداد آٹھ ہی ہے۔ ثانیاً اتباع سنت کا تقاضا یہی ہے کہ وہ آٹھ جاری کرتے۔ ثالثاً روایت کے اعتبار سے ثابت بھی یہی ہے کہ حضرت عمرؓ نے آٹھ ہی پڑھانے کا حکم دیا تھا۔ جیساکہ مؤطا امام مالک کی سائب بن یزید کی روایت سے ظاہر ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

عن السائب بن یزید انه قال امر عمرؓ ابی بن کعب و تمیماً الداری ان یقوما الناس فی رمضان باحدی عشر رکعات (الحدیث)

حضرت عمرؓ نے ابی بن کعب اور تمیم داری کو حکم دیا تھا کہ وہ لوگوں کو رمضان شریف میں گیارہ رکعتیں پڑھایا کریں۔ (بحوالہ مشکوٰۃ)

قال الباجی لعل عمر اخذ ذالک من صلوٰۃ النبی صلی اللہ علیه وسلم۔

باجی نے کہا، حضرت عمرؓ نے آٹھ کی تعداد شاید صلوٰۃ رسول سے لی ہے (تنویر الحوالک)

عن مالک انه الذی جمع علیه الناس عمر بن الخطاب احب الی وهو احدی عشر رکعة وهی صلوٰۃ رسول اللہ علیه وسلم قیل له احدی عشرة رکعة بالوتر۔ قال نعم وثلث عشرة قریب۔ قال ولا ادری من این احدث هذا الرکوع الکثیر۔

امام مالکؒ نے فرمایا جتنی رکعتوں پر حضرت عمرؓ نے لوگوں کو جمع کیا وہ مجھے زیادہ پیاری ہیں، اور وہ گیارہ رکعت ہی ہیں، اور یہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز ہے، ان سے پوچھا گیا، گیارہ رکعت مع وتر کہا ہاں اور تیرہ رکعت قریب ہے اور کہا کہ میں نہیں جانتا کہ یہ بہت سارے رکوع یعنی رکعتیں کہاں سے ایجاد کر لی گئی ہیں۔ (المصابیح فی صلوٰۃ التراویح للسیوطی)

آپ کا جواب دیکھتے ہوئے سمجھ میں نہیں آتا، کہ جب سنت نبوی آٹھ تھیں تو حضرت عمرؓ نے بیس رکعت کیوں جاری کیں۔ کیا ان کے نزدیک سنتِ رسول کی کوئی وقعت نہ تھی۔ یا سنت کی پیروی میں ثواب کی کمی کا احتمال تھا۔ یا بیس کے پڑھنے میں آٹھ کی نسبت اُمت کو آسانی تھی۔ یا بیس میں آٹھ کی نسبت خشوع و خضوع زیادہ ہو سکتا تھا۔ آخر کونسی ایسی مصلحت تھی۔ کون سا ایسا داعیہ تھا۔ جو حضرت عمرؓ نے ایک آسان سنتِ نبوی کا اہمال کر کے ایک مشکل کام کا اُمت کو حکم دیا۔

مذکورہ بالا حدیث جو سنداً بھی صحیح ہے اور متناً بھی، اتباعِ سنت کی آئینہ دار بھی ہے اور صحاح سے ہم آہنگ بھی۔ آپ نے اس کو تو چھوڑ دیا اور ضعاف کو لے لیا۔ جو کہ نہ روایتاً صحیح ہیں اور نہ درایتاً آخر کیوں؟ آپ کے نزدیک احادیث کے رد و قبول اور اس کی ترجیح کے کونسے پیمانے ہیں جن سے آپ ماپ تول کرتے ہیں۔ مہربانی فرما کر واضح تو کریں تاکہ ہم بھی کوئی اندازہ کر سکیں۔

جواب۔ "ایشیا" اور "شہاب" میں میرے درس کے جو خلاصے شائع ہوتے ہیں، ان کے متعلق بارہا خود ان دونوں اخبارات میں یہ وضاحت ہو چکی ہے کہ وہ میرے اصل الفاظ میں نہیں ہوتے، نہ میری پوری بات ان میں نقل کی جاتی ہے، اور نہ وہ مجھے دکھا کر شائع کیے جاتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود لوگ ان خلاصوں کو پڑھ کر میرے اوپر آئے دن سوالات کی بوچھاڑ کرتے رہتے ہیں حتیٰ کہ ان کی جواب دہی کرتے کرتے میں تنگ آ گیا ہوں۔ میں ان خلاصوں کی اشاعت پر صرف اس لیے راضی ہوا تھا کہ ملک نصر اللہ خاں صاحب عزیز اور کوثر نیازی صاحب کے خیال میں اس طرح میرے درس کا کچھ نہ کچھ فائدہ عام ناظرین کو بھی حاصل ہوتا رہیگا۔ لیکن اگر اُن پر سوالات کی پیدائش اسی رفتار سے جاری رہی جیسی اب تک رہی ہے تو مجھے مجبوراً ان دونوں حضرات سے یہ گزارش کرنی پڑیگی کہ اس سلسلے کو روک دیں۔ آخر میں دوسروں کی مرتب کردہ رپورٹوں کی جواب دہی کہاں تک کرتا رہوں۔

تراویح کی رکعات کا مسئلہ اُن مسائل میں سے ہے جن پر مدتہا دراز کے جھگڑوں اور مناظروں نے فریقین کو بے انتہا ذکی الحس بنا دیا ہے۔ اسی وجہ سے آٹھ رکعت یا بیس رکعت کا لفظ کسی کی زبان سے نکلتے ہی کوئی ایک گروہ اس پر آستینیں چڑھا لیتا ہے اور چیلنج بازی شروع کر دیتا ہے ......

مذکورۂ بالا سوال اسی کیفیت کا نتیجہ ہے۔ حالانکہ یہ مسئلہ ایسا نہیں ہے جس پر اتنے جھگڑوں کی کوئی حاجت ہو۔ اگر کسی کے نزدیک آٹھ رکعت ہی ثابت ہوں تو وہ آٹھ پڑھے اور خواہ مخواہ ۲۰ رکعت کو بدعت قرار دینے پر اپنا زور صرف نہ کرے۔ اور اگر کسی کے نزدیک ۲۰ رکعت ہی ثابت ہوں تو وہ ۲۰ پڑھے اور آٹھ رکعت پڑھنے والوں کی مخالفت میں وقت ضائع نہ کرتا رہے۔ دنیا میں اسلام اور مسلمانوں کو اس سے بدرجہا زیادہ اہم مسائل درپیش ہیں جو ہماری توجہ اور محنت اور اوقات اور اموال کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ اُن کو چھوڑ کر ان مسائل پر جھگڑے اور بحثیں کرنے میں سارا زور لگا دینا خدا کے دین کے ساتھ انصاف تو نہیں ہے۔

محترم سائل نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ آٹھ رکعت سے زائد پڑھنا خلاف سنت ہے، اور اس دعوے کی بنا انہوں نے اس بات پر رکھی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تراویح میں آٹھ ہی رکعت پڑھی ہیں۔ حالانکہ اگر اس بنیاد پر آٹھ رکعت سے زائد پڑھنے کو خلاف سنت کہنا درست ہو تو پھر تمام عمر میں تراویح صرف تین مرتبہ ہی جماعت کے ساتھ پڑھنی چاہیے اور اس سے زائد پڑھنے کو بھی خلافِ سنت قرار دے دیا جانا چاہیے۔ اس لیے کہ حضور سے باجماعت تراویح صرف اسی حد تک ثابت ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر اس معاملہ میں حضرت عمر کا یہ اجتہاد کہ ہر رمضان میں بالالتزام تمام مساجد میں ہر روز باجماعت تراویح کا اہتمام کیا جائے، آپ نے قبول فرما لیا اور اسے خلاف سنت قرار نہیں دیا تو آخر تراویح کے لیے ۲۰ رکعت مقرر کرنے کے بارے میں ان کا اجتہاد کس دلیل سے خلاف سنت ہو گیا۔

سائل فاضل کی یہ کوشش کہ حضرت عمر سے ۲۰ رکعت کے ثبوت ہی میں سرے سے شک پیدا کر دیا جائے، درحقیقت مکابرہ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ یہ بات قریب قریب یقینی طور پر ثابت ہے کہ حضرت عمر نے تراویح کے لیے ۲۰ رکعت مقرر کی تھیں، صحابہ نے اسے قبول کیا، اور ان کے بعد بھی خلفاء اور صحابہ کا عمل اس پر رہا۔ ترمذی کا بیان ہے:

واکثر اھل العلم علی ماروی عن عمر وعلی وغیرھما من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم عشرین رکعۃ۔	اکثر اہل علم اسی مسلک پر ہیں جو حضرت عمر اور حضرت علی اور اُن کے علاوہ دوسرے صحابہ سے مروی ہے، یعنی ۲۰ رکعت۔

محمد بن نصر المروزی نے حضرت عبداللہ بن مسعود کا یہی عمل نقل کیا ہے۔ ابن ابی شیبہ نے اسے حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت اُبی بن کعب اور متعدد دوسرے صحابہ کا اثر بتایا ہے۔ ابن عبدالبر کہتے ہیں کہ جمہور علماء ۲۰ رکعت ہی کے قائل ہیں اور صحابہ سے اس بارے میں کوئی اختلاف منقول نہیں ہوا ہے۔ المغنی میں ابن قدامہ لکھتے ہیں:

"امام احمد بن حنبل کے نزدیک تراویح کے معاملہ میں ۲۰ رکعت ہی کا مسلک مرجّح ہے اور اسی کے قائل سفیان ثوری اور ابوحنیفہ اور شافعی ہیں۔ مگر امام مالک ۳۶ کے قائل ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ قدیم سے اسی پر عمل چلا آرہا ہے ..... اس کے مقابلے میں ہمارا استدلال یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے جب متفرق طور پر تراویح پڑھنے والے تمام لوگوں کو اُبی بن کعب کی امامت میں جمع کیا تو حضرت اُبی ۲۰ رکعتیں پڑھاتے تھے ..... اور حضرت علی سے بھی یہی ثابت ہے کہ انہوں نے ایک شخص کو رمضان میں ۲۰ رکعت تراویح پڑھانے پر مامور کیا تھا۔ یہ عمل قریب قریب اجماع کا ہم معنی ہے ..... اگر یہ ثابت بھی ہو جائے کہ بعد میں تمام اہل مدینہ ۳۶ رکعت تراویح پڑھنے لگے تھے تب بھی جو کچھ حضرت عمرؓ نے کیا تھا اور جس پر صحابہ ان کے زمانے میں متفق ہو گئے تھے اسی کی پیروی کرنا زیادہ بہتر ہے۔" (جلد اوّل - ص ۷۹۸-۷۹۹)

اس کے مقابلہ میں محترم سائل کا تمام تر اعتماد صرف اس روایت پر ہے جو امام مالک نے مؤطا میں سائب بن یزید سے نقل کی ہے اور جس میں وہ کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے وتر سمیت ۱۱ رکعتیں پڑھنے کا حکم دیا تھا۔ لیکن اس سلسلے میں تین باتیں قابل غور ہیں۔ اوّل یہ کہ اسی مؤطا میں امام مالک یزید بن رومان کی یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے وتر سمیت ۲۳ رکعتیں پڑھنے کا حکم دیا تھا۔ مگر محترم سائل نے اس روایت کو نظر انداز کر دیا۔ دوم یہ کہ وہی سائب بن یزید جن سے امام مالک ۱۱ رکعت کی روایت نقل کرتے ہیں، ان سے ایک دوسری روایت بیہقی نے صحیح سند کے ساتھ ۲۳ رکعت کے حق میں نقل کی ہے، اور اس سے گمان ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اگر پہلے ۱۱ رکعتیں مقرر کی بھی تھیں تو بعد میں ان کو ۲۳ رکعت سے

بدل دیا ہوگا۔ سوم یہ کہ امام مالک خود ان دونوں روایتوں پر عمل نہیں کرتے بلکہ ۳۶ رکعتوں کے حق میں اس بنا پر فیصلہ دیتے ہیں کہ مدینے میں ایک صدی سے زیادہ مدّت سے تین رکعت وتر اور چھتیس رکعت تراویح پڑھنے کا طریقہ رائج تھا سیوطی المصابیح میں جو کچھ چاہیں کہیں مگر فقہائے مالکیہ اپنے امام کا یہی قول صحیح مانتے ہیں

اِن امور پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آٹھ رکعتیں ہی پڑھی ہیں لیکن صحابہ اور تابعین نے بالعموم حضور کے اس فعل کا مطلب یہ نہیں لیا ہے کہ آٹھ رکعت پڑھنا ہی سنت ہے اور اس سے زائد پڑھنا خلاف سنت یا بدعت ہے۔ آخر یہ کیسے تصوّر کیا جا سکتا ہے کہ صحابۂ کرام اور تابعین اور ائمۂ مجتہدین سنت اور بدعت کے درمیان تمیز کرنے کی اہلیت سے اس درجہ محروم تھے یا جان بوجھ کر وہ سنت کو چھوڑ کر ایک بدعت کو اختیار کر سکتے تھے؟

بہرحال اگر کوئی شخص حضور کے اس فعل کو اسی معنی میں لیتا ہو کہ آپ کا منشا ۸ رکعت ہی کو سنت کی حیثیت سے جاری کرنے کا تھا تو وہ شوق سے اس پر عمل کرے، اور جو اس معاملہ میں اس کے ہم خیال ہوں وہ اس کی پیروی کریں۔ لیکن ۲۰ رکعت کے دلائل اتنے کمزور نہیں ہیں کہ اسے خلاف سنت قرار دینا اتنا آسان ہو جتنا سمجھ لیا گیا ہے۔

عائلی قوانین اور شریعت

سوال۔ کیا عائلی قوانین کے نفاذ کے بعد کوئی شخص اگر شریعت کے مطابق کسی قسم کی طلاق دے تو وہ واقع ہو جائے گی؟ متذکرۂ صدر قوانین کی رُو سے تو طلاق کے نافذ ہونے کے لیے کچھ خاص شرائط عائد کر دی گئی ہیں۔

جواب۔ کسی حکومت کے قوانین سے نہ تو شریعت میں کوئی ترمیم ہو سکتی ہے اور نہ وہ شریعت کے قائم مقام بن سکتے ہیں۔ اس لیے جو طلاق شرعی قواعد کی رُو سے دیدی گئی ہو وہ عنداللہ اور عندالمسلمین نافذ ہو جائیگی خواہ ان قوانین کی رُو سے وہ نافذ نہ ہو۔ اور جو طلاق شرعاً قابلِ نفاذ نہیں ہے وہ ہرگز نافذ نہ ہوگی خواہ یہ قوانین اس کو نافذ قرار دیں۔ اب مسلمانوں کو خود سوچ لینا چاہیے کہ وہ اپنے نکاح و طلاق کے معاملات خدا اور رسول کی شریعت کے مطابق کرنا چاہتے ہیں یا ان عائلی قوانین کے مطابق۔

مطبوعاتؔ

تشبیہاتِ رومیؒ } تالیف۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم
شائع کردہ۔ ادارہ ثقافتِ اسلامیہ۔ کلب روڈ۔ لاہور
قیمت۔ آٹھ روپے۔ صفحات ۶۰۵۔

اسلامی ادب میں، شاید دو چار کتب ہی ایسی ہونگی جنہوں نے عالمِ اسلام کے افکار و ادبیات پر اتنا گہرا اور دیرپا اثر ڈالا ہو جتنا کہ مثنوی مولانا روم نے مترتب کیا ہے۔ چھ صدیوں سے مسلسل دُنیائے اسلام کے عقلی، علمی اور ادبی حلقے اس کے نغموں سے گونج رہے ہیں۔ بے چین طبیعتوں کو اس کی بدولت طمانیت قلب حاصل ہوئی۔ وہ لوگ جن کے دل کی انگیٹھیاں سرد پڑ چکی تھیں اُنہوں نے اس کے ذریعے عشق کی چنگاریاں روشن کیں اور اس طرح اپنے اندر ایک نیا ولولۂ حیات اور جوشِ زندگی پیدا کیا۔ وہ لوگ جو فلسفہ کی بھول بھلیوں میں اُلجھ کر تلاشِ حق میں ہمت ہار چکے تھے یہ مثنوی ان کے لیے روشنی کا مینار ثابت ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دَور کے اہلِ محبت اور اہلِ معرفت نے اس کو شمع محفل اور ترجمانِ دل بنا کر رکھا۔

بچہ جب تاریکی کے بھوتوں سے خوفزدہ ہو کر بھاگتا ہے تو وہ یہ نہیں چاہتا کہ اُس کے اس خوف کی نفسیاتی تحلیل کی جائے۔ وہ اس وقت اُسی سرگرم اور محبت بھری آغوش کی تلاش میں سرگرداں ہوتا ہے جس میں پناہ لے کر وہ اپنے ڈر کو بُھلا سکے۔ اسے اس شفیق اور تسکین بخش ہاتھ کی تلاش ہوتی ہے جس کو تھام کر وہ اس خوف کا مقابلہ کرسکے۔ مثنوی مولانا روم نے بالکل اسی اُصول کو سامنے رکھ کر انسان کی رہنمائی کی ہے۔ اس میں نہایت سادہ دلائل، دلنشیں مثالوں اور دلآویز حکایتوں کے ذریعے حیاتِ انسانی کے اسرار و رموز کی نقاب کشائی کی گئی ہے اور انسان کے دل میں اُس ذات کی محبت پیدا کرنے کی کوشش کیگئی ہے جس کی آغوش میں پناہ لے کر سارے غم اور کلفتیں ختم ہو جاتی ہیں۔

ہر دَور کے معلمین و متکلمین نے اپنے زمانہ کے سوالات و شبہات کو حل کرنے کے لیے اس سے استفادہ

کیا ہے۔ اس لیے اس پر مختلف زاویوں سے بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب تشبیہات رومی بھی اسی سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے۔ اس کتاب میں فاضل مصنّف نے اُن تشبیہات کی تشریح کی ہے جو مولانا نے دقیق و عمیق مضامین کو سادہ انداز میں سمجھانے کے لئے مختلف مقامات پر استعمال کی ہیں۔ مصنّف کا طرزِ نگارش نہایت سلجھا ہوا ہے۔ اور وہ اُن کے گہرے مطالعہ پر دلالت کرتا ہے۔

کتاب کو دیکھتے ہوئے دو چیزوں کی کمی محسوس ہوئی ہے۔ ایک یہ "مرشد رومی" خواہ علمی اور عملی اعتبار سے کتنے ہی بلند تھے لیکن وہ بہرحال معصوم نہ تھے۔ اُن کے کلام میں چند چیزیں ایسی ہیں جن سے فاسد العقیدہ صوفیوں اور اہل ہویٰ نے کبھی کبھی غلط فائدہ اُٹھایا ہے۔ وحدت وجود کے قائلین کو اب بھی اس سے اپنے مسلک کے لیے دلائل و شواہد مل جاتے ہیں۔ کتاب کے فاضل مصنّف اگر ایسے مقامات کی نشاندہی کر دیتے تو اس سے کتاب کی افادیت میں اضافہ ہو جاتا۔ دوسرے کتاب کے پروف پڑھنے میں قطعاً احتیاط سے کام نہیں لیا گیا۔ جگہ جگہ طباعت کی غلطیاں ذوق پر گراں گزرتی ہیں۔

کتاب ٹائپ پر نہایت اچھے انداز میں طبع کی گئی ہے۔ جو لوگ مثنوی مولانا روم کے شائق ہیں اور اس سے استفادہ کرنا چاہتے ہیں ان کے لیے یہ قابلِ قدر کتاب مقدمہ کا کام دے سکتی ہے۔

اسلام بیسویں صدی میں

مؤلفہ و مرتبہ۔ جناب ایم۔ محی الدین بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی

ناشر۔ ادارہ اوراق زرّیں۔ ریلوے روڈ۔ لاہور

قیمت۔ ساڑھے چار روپے۔ صفحات۔ ۲۷۴

زیر تبصرہ کتاب ایک دردمند اور صاحبِ دل نوجوان کی تالیف ہے۔ اس میں مؤلف نے اپنے خیالات کے علاوہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا محمد تقی امینی کی بعض مسائل کے متعلق تصریحات درج کی ہیں۔ مؤلف کا اخلاص اپنی جگہ قابلِ قدر ہے لیکن اس کتاب میں انہوں نے بعض ایسی باتیں کہہ دی ہیں جن سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر صفحہ ۳۰ پر رقمطراز ہیں:

"اجتہادی فیصلے، مسائل کا حل اور شریعت کی حدود کی صراحت ہمیں نصوص قرآنیہ سے ہی ملتی ہے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ قرآن مکمل ضابطہ حیات پیش کرتا ہے تو اس سے

ہماری مراد یہ ہے کہ زندگی کے شعبے کے لیے قرآن ایک اصول یا جہاں ضرورت ہو تھوڑی سی تفصیل کرتا ہے لیکن ضابطہ ہائے زندگی کے تمام اصولوں کی تفصیل اور جامع ہدایات تفصیلاً موجود نہیں۔ اس لیے ہمیں احادیث یا قرآن کی تفسیر پر تکیہ کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح قرآنی آیات کی تاویلات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ تاویلات اور تفسیر بیان کرتے وقت مختلف علماء نے تنگ نظری، خود غرضی اور کسی نظریہ یا عقیدہ سے لگاؤ کی وجہ سے ایک ہی آیت کی مختلف تاویلیں کیں۔ چونکہ عوام کو ان تاویلات پر تکیہ کیے بغیر چارہ نہ تھا، اس طرح غلط تاویلات کر کے بعض علماء فرقہ بندی کا موجب بنے اور اس طرح ملّتِ اسلامیہ جذباتی نعروں کا شکار ہو کر فرقہ بندی میں پھنس کر رہ گئی۔"

سب سے پہلے یہ دعویٰ کہ "شریعت کی حدود کی صراحت ہمیں نصوص قرآنیہ سے ہی ملتی ہے" بالکل غلط ہے۔ شرعی حدود کے تعیّن کرنے میں قرآن کے علاوہ حدیث بھی بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ پھر اسلام میں فرقہ بندی کی جو وجوہات بیان کی گئی ہیں وہ بھی صحیح نہیں۔ معلوم نہیں مؤلف کن باطل افکار سے متاثر ہو کر یہ بات کہہ گئے ہیں ورنہ دنیا جانتی ہے کہ حدیث نے مسلمانوں کو وحدتِ فکر اور وحدتِ عمل عطا کی۔ اس کے علاوہ اُنہوں نے علماء کا ذکر جس انداز سے کیا وہ بڑا تکلیف دہ ہے۔ دنیا کا کونسا ایسا گروہ ہے جس میں کچھ غلط کار لوگ نہ پائے جاتے ہوں۔ علماء کے اندر بھی بلاشبہ بعض کالی بھیڑیں پیدا ہوتی ہیں، مگر یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ بحیثیت مجموعی اس اُمت کی خدمت جس قدر علماء کے طبقہ نے کی ہے کسی اور طبقہ نے نہیں کی۔

پھر ہمیں مؤلف کی یہ بات بھی کوئی عجیب وغریب سی معلوم ہوتی ہے کہ ہمارے قدیم مفسرین کو عربی زبان سے نابلد قرار دے دیا جائے اور اُن کے بارے میں یہ کہا جائے کہ وہ "عربی زبان میں ملکہ نہ رکھتے تھے اور زبان کی سلاست، فصاحت و بلاغت اور محاورات صرف و نحو پر عبور حاصل کیے بغیر آیاتِ قرآنی کی افہام و تفہیم کے لیے میدان میں اُتر آئے"۔ ہمیں براہِ کرم فاضل مصنّف کسی ایک تفسیر کی نشاندہی کردیں جس میں کسی قدیم مفسّر نے یہ جسارت کی ہو۔ بالکل سطحی علم کے ساتھ مفسّرِ قرآن ہونے کا دعویٰ تو

ایک ایسا مرض ہے جو ہمارے اس دَور میں پھیلا ہے۔

کتاب میں اور کئی مقامات بھی ایسے ہیں جو نظرِ ثانی کے محتاج ہیں۔ ہم مؤلف کو ذاتی طور پر جانتے ہیں اور اُن کی حق پسندی سے پوری توقع رکھتے ہیں کہ وہ اپنے ان خیالات پر دوبارہ غور کر کے ان کی اصلاح کریں گے۔

عیسائیت کا پسِ منظر } تالیف۔ مولانا ابوالزاہد محمد سرفراز خان صاحب صفدر صدر مدرس مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ۔

ناشر۔ ادارہ نشرواشاعت مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ

صفحات ۱۲۸۔ قیمت سوا دو روپے۔

مولانا محمد سرفراز صاحب اس ملک کے علمی حلقوں میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ وہ ایک ٹھوس عالمِ دین اور ایک کامیاب مدرس ہیں۔ اور اُن کے اس تبحرِ علمی کی جھلک اُن کی ساری تصنیفات میں صاف دکھائی دیتی ہے۔ اُنہوں نے آج تک مختلف موضوعات پر جو کچھ تحریر فرمایا ہے اُس سے اختلاف کی گنجائش ہو سکتی ہے لیکن اُن کے علم کی وسعت اور فکر کی گہرائی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

زیرِ تبصرہ کتاب اُن کی ایک تازہ تصنیف ہے جس میں اُنہوں نے متعدد حوالوں کے ساتھ عیسائیت کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی ہے۔ کتاب کے مطالعہ کے وقت یہ تاثر کہیں کہیں ضرور قائم ہوتا ہے کہ عیسائیت کے بعض ایسے گوشے جو تفصیلی بحث کے محتاج تھے اُن میں بڑے اختصار سے کام لیا گیا ہے بمثال کے طور پر مسئلہ تثلیث، یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو عیسائیوں کے لئے بنیادی اہمیت کا حامل ہے؛ اس پر مصنّف نے بالکل سرسری طور پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ التوحید فی التثلیث وتثلیث فی التوحید بلاشبہ ایک چیستان ہے لیکن اس کی وضاحت ہمارے نزدیک اشد ضروری ہے۔

ختمِ نبوّت ۔ تالیف۔ مولانا حافظ محمد گوندلوی۔ ناشر۔ مکتبہ نعمانیہ اردو بازار گوجرانوالہ۔ قیمت۔ دس آنے۔

زیرِ تبصرہ کتاب میں مسلک اہلحدیث کے مشہور بزرگ اور عالمِ دین حافظ محمد صاحب نے مسئلہ ختمِ نبوّت پر اپنے مخصوص عالمانہ انداز میں بحث کی ہے۔

ہمارے مستقل خریداروں میں اپنا نام درج کرائیے !

(اور)

ہماری مطبوعات خصوصی رعائتی قیمت پر حاصل کیجئے

ہم نے اپنے خریداروں کے فائدے کے لیے طے کیا ہے کہ :-

ایسے تمام حضرات کو جو ہمارے یہاں بحیثیت خریدار درج رجسٹر ہونگے اپنی مطبوعات عام قیمت سے

بیس ۲۰ فیصد رعایت دیکر

کم قیمت پر مہیا کریں گے۔ پیکنگ خرچ و محصول ڈاک بذمہ خریدار ہوگا

رجسٹر میں اندراج کیواسطے آپکو نہ کوئی فیس داخلہ دینا ہوگی نہ کوئی مزید چندہ اور نہ ہی آپ اپنی مرضی کیخلاف کوئی کتاب خریدنے کے پابند ہونگے

اپنی پسند اور اپنی مرضی سے کتاب منتخب کیجئے اور رعائتی قیمت پر خریدیئے

جو نہی ہم کوئی کتاب طبع کرینگے ہم اپنے مستقل خریداروں کو اس سے تفصیلی طور پر مطلع کریں گے۔ شرائط حسب ذیل ہیں :-

۱- ابتدائی درخواست خریداری کے ہمراہ پانچ روپے بطور پیشگی (ڈیپازٹ) کمپنی میں جمع کرانا ہونگے۔ جب بھی آپ خریداری ختم کرنا چاہیں گے۔ آپ کو یہ رقم واپس کردی جائے گی۔

۲- ہر کتاب بذریعہ وی۔ پی بھیجی جائیگی۔ اگر کوئی طلب کردہ وی۔ پی۔ واپس ہوگئی تو ڈاک خرچ وغیرہ پیشگی میں سے وضع کرلیا جائیگا۔ آیندہ کتاب اسی صورت میں بھیجی جائیگی جبکہ ڈاک خرچ کے نقصان کی رقم وصول ہوجائے گی۔

۳- خریداری کیلئے کوئی مدت کا تعین نہیں ہے۔ آپ جب چاہیں اور جتنی قیمت کی چاہیں کتب خرید سکتے ہیں۔

۴- اگر آپ ہماری مطبوعات پچاس روپے کی یکمشت خریدیں گے تو محصول ڈاک بذمہ کمپنی ہوگا۔

۵- مخصوص کتابوں یا ان کے سستے ایڈیشنوں پر کمپنی کو کمیشن کی شرح تبدیل کا اختیار ہوگا۔

۶- دوسرے اداروں کی مطبوعہ کتب بھی نسبتاً رعائتی قیمت پر ہم اپنے مستقل خریداروں کو مہیا کرکے دیں گے۔ ان کے لیے مزید شرائط یہ ہوں گی :-

(ا) کوئی فحش یا خلاف اسلام کتاب مہیا نہیں کی جائے گی۔

(ب) ان کتابوں پر ہم ۶½ فی صد سے لے کر ۱۲½ فی صد تک کمیشن دے سکیں گے۔ کمیشن کی شرح کا فیصلہ ہماری صوابدید پر ہوگا۔

(ج) کمیاب اور بیرون پاکستان کی مطبوعہ کتابوں کی قیمت کا فیصلہ حالات کے مطابق ہوگا۔

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ - ۱۳ سی شاہ عالم مارکیٹ لاہور

الجہاد فی الاسلام

سید ابوالاعلیٰ مودودی

★

• اسلام کے نظریۂ جہاد پر ایک مدلل اور مستند کتاب

• اسلامی جہاد اور غیر اسلامی جنگ کا فرق

• اسلامی قوانینِ جنگ کا بین الاقوامی اور غیر مسلم اقوام کے قوانین جنگ سے موازنہ

• اسلام میں جہاد کی اہمیت، اس کی حقیقت اور اس کے حدود و شرائط

• غیروں کے طعنوں اور اپنوں کی معذرتوں کا جرأت مندانہ جواب

• اردو میں جہاد اسلامی پر پہلی، محققانہ اور بے مثال کتاب

عمدہ کتابت وطباعت

سائز $\frac{20 \times 26}{8}$ — صفحات تقریباً ۵۵۰

قیمت — اعلیٰ قسم — ۱۰٫۵۰ روپے

سستا ایڈیشن — ۷ روپے

★

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ

۱۱-سی شاہ عالم مارکٹ، لاہور